188705 ک
٨٩١٤٢٣٣٢
ع . ی

UNIVERSAL
LIBRARY
OU_188705
UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIB

۱۴۹۸۹

Call No. ۸۹۱٫۴۳۹۳۴ Accession No

Author عبدالشکور-ی

Title یاران میکده

This book should be returned on or last marked below.

۷۸۶

یارانِ میکدہ

(معہ اضافہ و ترمیم)

از

عبدالشکور، ایم۔ اے، بی۔ ٹی علیگ

پرنسپل حلیم مسلم کالج کانپور

کتاب خانہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ

(جملہ حقوق محفوظ)

طبع دوم سنہ ۱۹۳۳ء

مطبوعہ عزیزی پریس آگرہ

دیباچہ

اِن صفحات میں ایک درجن قلمی چہرے ناظرین کی خدمت میں پیش کئے گئے ہیں۔ کوشش کی گئی ہے کہ ہر کردار کی نمایاں خصوصیات مختصر پیرایہ میں بیان کی جائیں۔ اِس اختصار کے ساتھ اُمید ہے کہ کردار کی پوری تصویر ناظرین کے ذہن میں آجائے گی۔ اِس کردار نگاری میں مندرجہ ذیل امور کا خیال خاص طور سے کیا گیا ہے۔

(۱) ہر کردار کی نفسیات کا تجزیہ اشارۃً کر دیا گیا ہے۔ سائیکالوجی سے دلچسپی لینے والے حضرات، اس نقطۂ نظر سے اِن صفحات کو اگر پڑھیں گے تو یہ تحلیل نفسی موجبِ مسرت ہوگی؛

(۲) کیریکٹر صرف وہ لئے گئے ہیں جو عموماً سوسائٹی میں پائے جاتے ہیں اور اپنی چند در چند خصوصیتوں کی وجہ سے جاذبِ نظر ہوتے ہیں۔ اِن میں ایسے حضرات بھی ہیں جو دنیا میں کامیاب ہیں

اور وہ بھی موجود ہیں جن کو زندگی کے کسی پہلو میں کامیابی حاصل نہیں ہوتی، لیکن ہر فرد بجائے خود اپنے گرد وپیش کا مرکز بنا ہوا ہے؛ اور ہمارے لئے غیر معمولی دلچسپیوں کے اسباب فراہم کرتا ہے۔

(۳) طرزِ تحریر میں مزاحیہ رنگ موجود ہے، ادبی پیرایہ شاید بہتر نہ ہو۔ لیکن اس کی ضرور کوشش کی گئی ہے کہ اس رنگ میں سنجیدگی اور متانت قائم رہے۔

(۴) یہ کردار فرضی، ان کی بناوٹ فرضی اور ان کے نام فرضی ہیں؛ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان میں حیات کے آثار پیدا ہوئے بھی یا نہیں؛ ان کا دلکش ہونا اتنا ضروری نہیں جس قدر کہ ان کا ذی حیات ہونا ضروری ہے۔ ناظرین خود اس کا اندازہ فرمائیں کہ ان میں زندگی ہے؟ اور اگر ہے تو کہاں تک؟

ع۔ ش

دیباچہ طبع ثانی

"یارانِ میکدہ" کو باوجود خامیوں کے جو مقبولیت حاصل ہوئی، اور مختلف رسائل میں جو حوصلہ افزا ریویو اس پر کئے گئے اس سے یہ جرأت ہوئی کہ دوبارہ نظرِ ثانی اور اضافے کے بعد شائع کیا جائے۔

طباعت و کتابت کی وہ خامیاں جو پہلے اڈیشن میں تھیں اس مرتبہ آپ نہ پائیں گے اس لئے کہ یہ کام ملک کے ایک بلند مرتبہ ناشر مکتبہ دانش محل کے ہاتھوں انجام پا رہا ہے۔

ع۔ش

فہرست مضامین

۱۔ جلوے کا تماشا ۷
۲۔ بند ابی ۱۹
۳۔ مولوی ۲۹
۴۔ ط۔ ظ ۳۷
۵۔ حافظ جی ۴۵
۶۔ داروغہ جی ۵۷
۷۔ بقا صاحب ۶۷
۸۔ قومی رضاکار ۷۹
۹۔ میجر عبداللہ ۹۳
۱۰۔ کالے خاں ۱۰۱
۱۱۔ باجی ۱۱۱
۱۲۔ سقوط اشتہا ۱۱۹
۱۳۔ چھوٹے ۱۲۹

جلوے کا تماشا

اِس ارضِ مقدس میں جہاں کنوؤں درختوں اور کھیتوں تک کی شادیاں ہو جاتی ہیں، وہاں بھلا حضرتِ انسان کیا محروم رہتے۔

غریب سے غریب، بیمار سے بیمار، بدصورت سے بدصورت، اور ناکارہ سے ناکارہ نہ صرف اپنی ہونے والی شادی پر ایمان و ایقان رکھتا ہے بلکہ یہ عالمگیر سانحہ اس کی زندگی میں ہو کر ہی رہتا ہے، ہندوستان کی دنیا میں کوئی ایسی طاقت نہیں ہے جو اس سانحہ عظیم کا سدِ باب کر سکے، ہمارے ملک میں کتنے کروڑ انسان ہوں گے جو مذہبی

اور قانونی طریقہ پر کسی نہ کسی کے شوہر ہیں، ان میں کتنے کامیاب ہیں، کتنے سر پکڑ پکڑ کر رو رہے ہیں اور کتنے بے حس ہیں، ان کی صحیح مردم شماری بہت دشوار ہے۔ یہ بھی ضرور ہے کہ شوہر کی کامیابی ہرگز کامیابی نہیں ہو سکتی ہے جب تک کہ خود اس کی بیوی اس کو کامیابی کی سند نہ عطا کرے، اِس معاملہ میں تو کم از کم آپ خود میاں مٹھو نہیں بن سکتے۔ مگر دقت یہ ہے کہ عورتیں اپنے شوہروں کی نہایت باریک بیں اور معاف نہ کرنے والی ممتحن ہوتی ہیں۔

ہم عورت کی نفسیات کے ماہر نہیں ہیں، اِس علم میں مہارت صرف عورت ہی پیدا کر سکتی ہے، ایک عورت دوسری عورت کو سونگھ کر ہی پہچان لیتی ہے، مرد اگر ہزار سال تک کوشش کرتا رہے گا وہ عورت کی گرد تک کو بھی نہ پہنچ سکے گا۔ دونوں کی جنس مختلف، طبیعت مختلف، زاویۂ نگاہ مختلف؛ مرد لاکھ سر کھپائے عورت کی پیچیدگی اور عورت کی فطرت کا تار و پود اس کی سمجھ میں حشر تک نہ آ سکے گا۔

عورت کے چہرے دو، آوازیں دو، طبائع دو، اور خیالات کی دنیائیں دو ہوتی ہیں، ایک دنیا تو اِس کے

دکھا دے کی دنیا ہوتی ہے اس دُنیا میں وہ مرد کو آنے دیتی ہے، اس کے علاوہ اس کی ایک اور دنیا ہوتی ہے، نہایت خاموش ساکت، جامد، اور اندھیری دنیا، اس دنیا میں پرندہ پر تک نہیں مار سکتا، شوہر، باپ، بھائی، بیٹے یا کسی مرد رشتہ دار کو وہ اس دُنیا میں حشر تک داخل نہ ہونے دے گی، بڑے سے بڑے وکٹوریہ کراس پائے ہوئے جبروتی شوہر دنیا کو چکا چوند کر دینے والی اپنی قہاری و جباری کے باوجود ایک منٹ کے لئے بھی اس دنیا میں قدم نہ رکھ سکے۔

بعض ماہرین کا خیال ہے کہ اگر عورت محبت کرتی ہے تو وہ اس مخفی دنیا کو بھی اپنے محبوب کے قدموں پر نچھاور کر سکتی ہے۔ ہم اس کو باور کرنے کے لئے تیار نہیں۔ عورت اگر اس دنیا کو اپنے محبوب کے قدموں پر نچھاور بھی کرنا چاہے تب بھی نہیں کر سکتی۔ فطرت نے یہ قدرت اُسے عطا ہی نہیں کی۔ اپنی خواہش کے مطابق اس دُنیا سے وہ کسی مرد کو سیراب اور سرفراز و سربلند نہیں کر سکتی، ہمیں اس کا تعجب نہیں ہے کہ دنیا میں شوہروں اور بیویوں کے جھگڑے اس قدر کثرت سے کیوں ہوتے ہیں بلکہ ہمیں اس کا تعجب ہے، اس پر حیرت ہے کہ اس سے زیادہ

کیوں نہیں ہوتے۔ جو جو شادیاں آپ کے نزدیک کامیاب ہیں، جو میاں بیوی آپ کے خیال میں عاشق و معشوق ہیں جن کے ہاں شب و روز محبت اور اُلفت سے لبریز جام چلتے ہیں۔ جن کے ہاں دن عید اور رات شب برات ہوتی ہے، اُن خوش نصیب شوہروں کی بظاہر ہشاش بشاش بیویوں کے دلوں کی گہرائیوں پر ایک غائر نظر ڈالیے۔ جس سطح دل پر مسرت و شادمانی کے بیل بوٹے بکھرے پڑے ہوتے ہیں اس سطح کی تہ میں ایک تیز گام چشمہ آپ کو نظر آئے گا جس میں غم، غصہ، نفرت اور تلخی کی اُبلتی ''غرّاتی'' اور ''پھنکارتی'' ہوئی لہریں مصروفِ پیچ و تاب ہوں گی۔ اس کے برعکس جن جن نازک اور پاکیزہ دلوں میں بظاہر غم و غصہ ہوتا ہے عجب نہیں کہ ان خوبصورت دلوں کی گہرائیوں میں اطمینان مسرت، اور شادمانی موجود ہو۔ لیکن یہ وہ حقائق ہیں، وہ سربستہ راز ہیں جن کا عرفان سوائے ایک عورت کے نہ کسی کو حاصل ہوا ہے، اور نہ حاصل ہو سکتا ہے۔

شوہر میں کیا کیا خوبیاں ہونا ضروری ہیں؟

کن کن خوبیوں کے حامل شوہر کامیاب اور مطمئن ہو سکتے ہیں؟
سوال بڑا دلچسپ ہے لیکن کس قدر مہمل! کس قدر بے معنی اور لغو سوال ہے!!

میری ایک نہایت دلچسپ اور ہوشمند دوست عورت نے اس سوال کو سن کر قہقہہ مارا، اور میری حماقت پر، میری بیہودگی پر دل کھول کر ہنسیں۔ ارشاد ہوا کہ اس کا جواب ایک عورت ہی دے سکتی ہے۔

میں نے ادب سے عرض کیا کہ یہ ناممکن ہے، اس کا جواب عورت دے تو ضرور سکتی ہے لیکن کبھی ایسی جسارت نہ کرے گی۔ اس کا جواب سکوت تھا، خاموشی تھی پُر معنی الفاظ سے زیادہ فصیح، اور غالب کے اشعار سے زیادہ بلیغ خاموشی، جو سوائے عورت کے دنیا میں کسی اور مخلوق کو فطرت نے عطا نہیں کی۔

دُور کیوں جائیے، اسی سکوت کے فلسفہ پر غور کرنا شروع کر دیجئے، ملاحظہ فرمائیے کہ عورت کی ہر خاموشی کتنے ہزار، اور کتنے متضاد خیالات کی ترجمانی کرتی ہے؛

پھر بھلا مرد کا کیا مقدور ہے کہ وہ ان باریکیوں کو سمجھے،
پیچ ہے ع

"آنکھ والا ترے جلووں کا تماشا دیکھے"
مگر —— دیدۂ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے! جہاں تک عورت کی فطرت کا تعلق ہے مرد کور باطن بھی ہے اور کور نظر بھی، اس پر لطف یہ کہ ابتدائے آفرینش سے مرد اور عورت ایک دوسرے سے اس قدر گہرے طور پر وابستہ اور منسلک ہیں کہ ایک دوسرے سے ابد تک کے لئے پیوست ہو گئے ہیں؛

مسٹر خورشید بزعم خود حسین ہیں، نوجوان ہیں، برسرِ روزگار ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اُن کی بیوی ثریا اُن پر ہزار جان سے عاشق ہے، مگر حقیقت میں ثریا کے دل کی حالت نہایت دگرگوں ہے، وہ سب کچھ کر سکتی ہے لیکن خورشید کی خود غرضی برداشت نہیں کر سکتی، اُسے اپنے شوہر کے حسن، جوانی اور دولت کا یقین ہے۔ لیکن وہ محبت کی طلبگار ہے، ایثار کی متلاشی ہے؛ اور قربانیوں کی جویا ہے؛ خورشید۔ اوّل تو اِس مطالبہ سے لاعلم ہے، دوسرے اگر اُسے اس مطالبہ سے آگاہی بھی ہو جائے تب بھی اس کی ناکامیابی کامیابی میں تبدیل نہ ہو سکے گی؛ وہ خود غرض ہے؛ وہ خود پرست

ہے خود محبوب بننے کا آرزومند ہے، چاہتا ہے کہ اُسے چاہا جائے، وہ خود کسی کے خیالوں کا اور کسی کی محبتوں کا مرکز بنے، ثریا سب کچھ دیکھتی ہے پرکھتی ہے، اور سمجھتی ہی طبیعت پر زور رڈال ڈال کر، کوشش کرکے اس نے بظاہر خورشید کو اپنی آرزوؤں کا مرکز بنا لیا ہے، اور کئی سال سے یہ ناٹک بڑی کامیابی کے ساتھ کھیلا جارہا ہے —— لیکن کیا آپ کو علم ہے کہ ثریا کے دل کی سب سے نچی سطح پر چند چنگاریاں پرورش پا رہی ہیں جو ثریا کے حکم سے کل ہندوستان میں آگ لگا سکتی ہیں، یہ خدا کا بہت بڑا احسان ہے کہ ان چنگاریوں کی محافظ ثریا ہے خورشید نہیں، گو قانون کے ذریعہ سے ستی کی رسم مٹا دی گئی ہے، لیکن ہزاروں ثریائیں اب بھی ہیں جو اِس آگ میں عمر بھر جل جل کر فنا ہو جاتی ہیں اور خورشید نما چوپائے کو یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ ہوا کیا، یہ قصہ کیا تھا، کون مرا، کون جیا، کون فنا ہوا؟ اور پھر یہ مغالطہ کہ ہم عورت کی نفسیات کے ماہر خصوصی ہیں!؟!

میرے دوست کو یقیناً میرے اوپر خندہ زن ہونا چاہئے تھا!

گالزوردی کے "ساگا" میں دو کرداروں کا اجتماع
ضدّین ہمیں مدتوں یاد رہے گا: ماہوش آئرین، جو اپنی پُرجلال
خوبصورتی اور صفات ملکوتی کی وجہ سے ایک عالم میں تہلکہ
مچاتے ہوئے ہے۔ ایک کروڑپتی (سومس) کی زوجہ ہے،
سومس اُس سے نکاح تو کرچکا ہے، اس کے ساتھ رہتا بستا
بھی ہے لیکن اب تک اس کے دل کو نہ موہ سکا ہے، اِس کی
جنبشِ ابرو کا غلام ہے، اس کے اشاروں پر رقص کرتا ہے،
اس کی رضاجوئی کے لئے ہزاروں تدبیریں کرتا ہے، اس کے
لئے ایک عالیشان قصر تیار کرتا ہے اس کے اردگرد ایک باغ
اِرم مرتب کرتا ہے جس کا حسن و جمال اور سرسبزی و شادابی
دیکھنے کے لئے لوگ دُور دُور سے آتے ہیں، ہزارہا پونڈ خرچ
کرکے اس قصر میں ایک پکچر گیلری سجاتا ہے، نادر سے نادر
مجسمہ خریدتا ہے، بہتر سے بہتر اور قیمتی سے قیمتی فرنیچر مہیا کرتا
ہے لیکن ماہوش آئرین دولت اور آرٹ کے اُن مرتب انباروں
پر نگاہِ بے پروا، ڈالتی ہوئی، اِن نعمتوں کو ٹھکراتی ہوئی، سومس
کے محبت سے بھرے دل کو پامال کرتی ہوئی، مناکحت کی زنجیروں
کو توڑتی ہوئی، اپنے پرستاروں کے دلوں کو برماتی ہوئی،

اپنے چاہنے والوں کے قلوب کو پھلتی ہوئی، فضائے بسیط کی گمنام تاریکیوں میں خدا جانے کہاں سے کہاں نکل جاتی ہے،
اگر آپ کو یہ موقعہ مل سکتا تو آپ دیکھتے کہ اس کے دل کے نہاں خانہ میں ایک کوہ آتش نشاں موجود ہے، جس کا اُبلتا ہوا لاوا دہکتی ہوئی آگ، اور دم گھونٹ دینے والا دھواں صرف ایک عورت ہی کے زیر نگیں رہ سکتا ہے،
بڑے سے بڑا ہٹلر ان پر قابو نہیں پا سکتا۔

دنیا کا یہ ایمان ہے کہ کبیر اور بیگم کبیر بڑی محبت اور راحت کی زندگی بسر کر رہے ہیں، اس خیال کو جزو ایمان بنانے کے وجوہ بھی کافی سے زیادہ موجود ہیں، ان کے گھر کی چار دیواری سے گذر کر ان کے مسرت آمیز قہقہے سارے محلّے والوں کے دلوں میں رشک کے جذبات پیدا کرتے ہیں، دونوں محبت کے پیاسے پی پی کر اکثر چاندنی راتوں "جُبلی باغ" میں محوِ خرام پائے جاتے ہیں ان میں اس کے علاوہ ایک اور کمال بھی ہے، موسم کے تہواروں سے پوری پوری طرح لطف اندوز ہوتے ہیں، ہولی کے زمانہ میں رنگ پاشی کرتے ہیں، دیوالی میں

اپنے اپنے دلوں کے کنگروں پر محبت کے دیئے جلاتے ہیں،
محلہ والے یہ تماشے اکثر دیکھا کرتے ہیں، ان پر تنقید و تبصرہ
کرتے رہتے ہیں، ان کا ایمان ہے کہ اس سے زیادہ کامیاب
اور محبت کرنے والا جوڑا دنیا بھر میں شاید ہی کہیں مل سکے،
لیکن ہمیں یقین ہے کہ اگر آپ کو بیگم کبیر کے اندرونی خیالات
اور جذبات و احساسات کا پتہ چل جائے تو آپ کا قصرِ ایمانی
متزلزل ہو کر منہدم ہونا شروع ہو جائے گا،

صرف فرق یہ ہے کہ بیگم کبیر ایک مکمل عورت ہیں، انھوں
نے آج تک کسی کو اپنے دل کے سطحِ زیریں پر آنے نہ دیا، ورنہ
آپ کو معلوم ہو جاتا کہ

دنیا بھر میں کوئی ایسی شکایت نہیں جو اُن کو کبیر سے نہ ہو،
کوئی ایسا گناہ نہیں جو اُن کے خیال میں کبیر سے سرزد
نہ ہوتا ہو،

کوئی ایسی خامی نہیں جو اُن کے شوہر کے کیریکٹر میں پائی
نہ جاتی ہو،

اِن تاروں کو چھیڑنا ایک نہایت دشوار امر ہے، اِن کو
چھیڑ کر دیکھئے، پھر ملاحظہ کیجئے گا کہ اِن تاروں سے کیسے کیسے راگ س

کُن اور غم انگیز نغمے پیدا ہوتے ہیں، لیکن یاد رہے کہ یہ نغمے وہ نغمے نہیں ہیں جو تاروں سے نکلنے کے لئے بیتاب ہوں۔

بیگم کبیر اس موضوع پر ہمیشہ خاموش رہتی ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ مرتے دم تک خاموش اور ساکت ہی رہیں گی، لیکن اُن کے جذبات بالعموم یہ ہیں:۔

لاکھ سمجھاتی ہوں کہ دورہ کی ملازمت ختم کرو،
الاؤنس نہ سہی اس کے بغیر بھی گذر جائے گی،
لیکن دَورہ کا چسکا ایسا پڑ گیا ہے کہ میرا سمجھانا
بے کار ہے .... بچے بیمار پڑیں تو میں
علاج معالجہ کراؤں، فیل ہوں تو میں پاس
کراؤں، .... ان کی تعلیم میرے ....
ذمہ .... شبیر بڑا ہو چلا ہے ....
میرے قابو سے باہر ہو رہا ہے .... مگر
کون سنتا ہے .... اپنے حلوے مانڈے سے
مطلب .... وہ تو یہ کہو میں خود بیمار نہیں پڑتی
ورنہ ایک گھونٹ پانی دینے والا نہ ملے ....
ایسی بھی خود غرضی کیسی .... ایسے بھی روپیہ

کی محبت کے کیا معنی......... گھر کا گھروندا ہو رہا ہے، شبیر ناہموار ہوا جاتا ہے ....

اِن الفاظ کے نیچے آگ ہے، غم ہے، غصہ ہے، اضطراب ہے، اضطرار ہے، .... اور ان جذبات کے باوجود وہ قہقہے، نقرئی قہقہے بھی ہیں، جو محلہ کی فضا کو مسرت و شادمانی سے معمور بنائے ہوئے ہیں۔

اے عورت! اے معمّر کائنات!!

سچ ہے۔ ع

آنکھ والا ترے جلووں کا تماشا دیکھے

مرد، لاچار مرد کہاں سے یہ "آنکھ" لائے؟

اور............ کیا دیکھے؟

بُندابی

ہمارے خیال میں ہر خاندان میں کم از کم ایک تو نانی عشو ضرور ہوتی ہیں، ہمارے خاندان میں تو ایک تھیں، اللہ اُن کو جنت نصیب کرے، سارے خاندان کی نانی تھیں، اَب تک ہمیں یاد ہے اُن کا آنا، اُن کا جانا، ہر چھوٹے بڑے سے محبت کرنا، ہر کہہ و مہ کے دُکھ درد میں شریک ہونا، "ہر غمی میں سب سے پہلے اور ہر شادی میں سب کے بعد پہونچنا، باتیں اُن کی کبھی ختم نہ ہوتی تھیں، لیکن اُن کی باتوں کی مٹھاس اور اُن کے پاک وصاف دل کی سچّی اور بے ریا محبت ہر شخص کے دل پر اثر کئے بغیر نہ رہتی تھی، بہت عمر پائی آخر میں بہت

ضیعف دنا تواں اور بہری ہوگئی تھیں، لیکن اُن کا وہ مُحبت کا سلوک اور آنا جانا آخر دم تک برابر جاری رہا۔

نانی عشو کے بہت اولاد ہوئی، مگر سب سے آخری اولاد سے اُن کو سب سے زیادہ مُحبت تھی،

وہ اُن کی شہرۂ آفاق صاحبزادی تھیں بی بُندہ بیگم، بلا کی بدمزاج، ناہموار، ہر وقت گویا سُلگتی رہتی، ہر وقت اُسکے دل سے دھوئیں اُٹھتے رہتے، ہر وقت اُس کا خون کھولتا رہتا

بُندہ بیگم کے کردار کو سمجھنے کے لئے غیر معمولی ذہانت کی ضرورت ہے، اُس کے پہلو میں یا تو دراصل بجائے ایک کے دو دل تھے، یا اگر ایک ہی دل تھا تو اس کے دو برابر کے علیحدہ علیحدہ ٹکڑے تھے جن کے مابین کبھی ختم نہ ہونے والی ایک جنگ ہمیشہ برپا رہتی؛

ذرا سی دیر میں ہنسنے لگتی، شعر پڑھنے لگتی، گنگنانے لگتی، چوچلے کی باتیں کرنے لگتی، اس کے بعد ہی بقول اس کے سر میں "کوندا" ہونے لگتا آنکھیں اس طرح بھینچنے لگتی گویا گولی اس کے کلیجہ کے پار ہوگئی ہے، یک لخت یاس انگیز لہجہ میں، دُنیا

کی بے ثباتی، اور انسان کی گمراہی کا ایسے سوز و گداز سے بیان
کرنا شروع کر دیتی کہ گویا وہ کسی درویش کی خالہ ہے۔

خاندان میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کو بُوا بندہ بیگم
کے دیکھتے ہی بخار چڑھ آتا ہے ہمیں تو اس کے کہہ دینے میں
ذرا باک نہیں کہ ہم نے صورت دیکھی اور ہمارا خون خشک ہونا
شروع ہوا، اس کی دو وجہ ہیں:
ایک تو یہ کہ بوا ایک معمہ ہیں، ایک چیستاں ہیں جو ناممکن
ہے کہ آپ کی سمجھ میں آجائیں لاکھ جتن کیجئے، سر ٹپک کر مر جائیے،
آپ یہ ہرگز معلوم نہیں کر سکتے کہ اس وقت بوا ہنسے گی، ہنسائیگی،
یا رُوئے گی اور رُولائے گی،
ہمیشہ آپ کو دیکھتے ہی ایک آدھ گندی اور ناپاک پھبتی
ضرور کسے گی کسی گمنام ناہموار شعر کی ایک بے معنی ٹانگ آپ کے
سر پر ضرور دے مارے گی، اس کے جواب میں اگر آپ ہنسنے لگے
تو وہ روئے گی اور رُولائے گی! آپ اگر جز بز ہوئے اور
سنجیدہ بنے رہے تو وہ اس طرح تھرکے گی، ایسی ایسی دل آویز
مگر بیہودہ باتیں کرے گی کہ جو آپ کی چھوٹی سالی بھی نہ کر سکے گی،

دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمارے نزدیک بوا بُندہ بیگم کے دل میں خلوص نہیں ہے، حالانکہ وہ خود اور سارے خاندان والے اس پر ایمان لائے ہوئے ہیں کہ بوا سے زیادہ مخلص اور بے ریا ہستی کی آج تک تخلیق ہی نہیں ہوئی۔ لیکن ہم مجبور ہیں ہمارا دل یہی گواہی دیتا ہے کہ بوا سے اور خلوص سے کوئی تعلق نہیں، حالانکہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اس حقیقت کا معلوم کر لینا کوئی آسان کام نہیں ہے،

چہرہ ان کا اس قدر مسکین ہے کہ خدا کی پناہ کسی پاکدامن سے پاک دامن اور زاہد شب زندہ دار زن، کے چہرے پر بھی مسکینت اور ثقاہت کی وہ خارجی کیفیت نہ ہوگی جو اُن کے چہرے پر موجود ہے، وہ اس درجہ محبت آفریں، نرم، ہلکے پھلکے اور پست لہجہ میں گفتگو کرتی ہیں کہ بعض وقت اُن کو سمجھنا تک مشکل ہو جاتا ہے،

پھر مذہب کا رنگ ان پر اس قدر گہرا چھایا ہوا ہے کہ اس تیز اور شوخ رنگ کو دیکھ کر ہمیں اُن سے اور اُن کے مذہب سے نفرت پیدا ہونے لگتی ہے صبح کو ڈیڑھ دو گھنٹہ قرآن پاک ضرور پڑھیں گی، آہستہ آہستہ رُک رُک کر، شروع سے آخر تک غلط سلط

پڑھتی چلی جائیں گی، ان کے نزدیک یہ عبادت ہو گئی، اور جنت میں اُن کے محل کی بنیاد پختہ ہو گئی، بفرض محال اس قرآن خوانی کو اگر آپ عبادت سمجھ بھی لیں تو یہ کیا ستم ہے کہ وہ جب تک قرآن شریف پڑھتی رہتی ہیں تب تک وہ کنکھیوں سے باورچی خانہ کو دیکھتی رہتی ہیں، اور قرآن پاک کی تلاوت ختم کرتے ہی جا بجا اس کا اعلان کریں گی اور اس بھونڈے طریقہ سے مذہبی فوجداری شروع کر دیں گی کہ لوگوں کو مذہب کے نام سے امتلاء شروع ہونے لگتا ہے۔

ہم اوپر قرآن خوانی کے سلسلہ میں باورچی خانہ کا ذکر کر آئے ہیں، ناظرین نے اندازہ کر لیا ہو گا کہ بوا کو گھر کے کسی حصہ سے اتنی دلچسپی نہیں جس قدر کہ باورچی خانہ سے، اس معاملہ میں وہ اپنے اور پرائے گھر کو یکساں سمجھتی ہیں اپنے قول کے مطابق وہ ہر شخص سے خلوص برتتی ہیں، اُنھیں ہر گھر سے اتنی محبت ہی کہ وہ ہر گھر کو اپنا ہی گھر سمجھتی ہیں وقت کی بھی کوئی پابندی نہیں، جس گھر میں وہ جس وقت پہنچتی ہیں سب سے پہلے بغیر کسی مشورہ اور اطلاع کے وہ اِس گھر کے باورچی خانہ اور نعمت خانہ کا جائزہ

پینے لگتی ہیں، کوئی چٹنی، کوئی مربہ، کوئی سالن، کوئی گوشت، کوئی ترکاری ایسی نہیں ہوسکتی جس کو وہ چکھنے سے گریز کریں، روٹی اگر تازی ہے تو سبحان اللہ، دو دن کی باسی ہے تو جزاک اللہ، کھانا شروع کرنے سے پہلے ان کو اس کے اعلان کرنے کی سخت ضرورت ہے کہ ان کا کلیجہ ٹوٹ رہا ہے، جب تک کھاتی جائیں گی تب تک ایسا منھ بناتی جائیں گی کہ گویا وہ زہر کھارہی ہیں اور درد وکرب سے بے چین ہیں، کھانے کے دوران میں ہر کھانے کو برا کہنا،

اس میں نمک نہیں ہے،

اس میں مرچ بہت ہے،

یہ میٹھا ہے، برابر جاری رہے گا۔ کھانے کے بعد انھوں نے نہ کبھی ہاتھ دھویا، نہ کبھی منہ صاف کیا، نہ کبھی کلی کی، اور گھر والوں پر احسان جتانا شروع کیا وہ الگ، ان کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ نفلیں پڑھو، اپنی قسمت پر ناز کرو کہ میں نے تمھاری روٹی چکھ لی، ورنہ تم کہاں اور میں کہاں، اس کے بعد ہی وہ خود بہ خود پاندان پر آدھمکیں گی، دو کرارے دل دار پان بنا کر کھائیں گی اسی دوران میں مذہب کی تبلیغ، دنیا کی بے ثباتی، اور آپ کی

خانہ داری کی بد انتظامی کا حال ایسے قاتل زہر سے بُجھے ہوئے الفاظ میں دُہراتی رہیں گی کہ سُننے والوں کے کلیجوں کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے، اس کے بعد ہی برقع سر پر رکھا اور برابر والے گھر میں جا دھمکیں اور اپنی ان ہی حرکات کو پھر دُہرانا شروع کردیا۔

بوا اس غلط فہمی میں اپنے آپ کو مبتلا رکھتی ہیں کہ وہ بے انتہا ہر دل عزیز ہیں، ہر گھر میں اُن کا خیر مقدم ہوتا ہے، ہر گھر والی (دوالا نہیں!) اُن پر ہزار جان سے عاشق ہے۔ جب تک ڈولیوں میں آمد و رفت ہوتی تھی تب تک بُوا اُبندہ بیگم کم آتیں، اور دیر تک قیام کرتی تھیں، اب برقعوں میں پھرنے کا رواج ہو گیا ہے، لہٰذا صبح شام سر پر سوار ہیں گو برنگ بوا ادھر آئیں اُدھر روانہ ہوئیں کسی جگہ قیام نہیں کسی گھر میں قرار نہیں، ایک گھر میں پان لگایا، دوسرے گھر میں چھالیا ڈالی۔ تیسرے گھر میں اُسے جا کر کھایا، کہیں رو رہی ہیں، کہیں خفا ہو رہی ہیں، کہیں ہنس رہی ہیں، ہنسا رہی ہیں، اسی اعتبار سے لوگ اُن کو "جلے پیر کی بلی" کہنے لگے ہیں۔

بوا معمولی روزمرہ کی زندگی کی رَو سے بہت جلد اُکتا
جاتی ہیں، ان کو تغیرات، انقلابات، اور ہنگاموں کی اشد
ضرورت ہے، ہنگامہ جس قدر زیادہ محشر خیز ہوگا بوا اسی قدر
زیادہ مسرور وشاداں ہوں گی، کسی عورت کی معمولی بیماری
سے وہ خوش نہیں ہوتیں؛

عورت نہ صرف بیمار ہو بلکہ ایک مہلک اور شدید مرض میں
مبتلا ہو کر مرے خاندان میں کہرام مچے، میاں جنگل کو نکلے، گھر میں
ہل چل جائے تب کہیں اُن کے دل کی کلی کھلتی ہے، اس لئے
نہیں کہ وہ خدانخواستہ کسی کی موت کی آرزومند ہوتی ہیں بلکہ
صرف اس لئے کہ وہ ہنگامہ پسند ہیں۔ میاں بیوی کے تعلقات
اگر پُر سکون اور سنجیدہ طریقہ سے مسرت آمیز ہیں تو آپ کے گھر
سے اُن کو ذرا بھی دلچسپی نہ ہوگی، جب تک بیوی کی چُٹیا میاں کے
ہاتھ میں اور میاں کی ڈاڑھی بیوی کے ہاتھ میں نہیں آجاتی وہ کچھ
پژمردہ سی کچھ ملول سی ہی رہتی ہیں کسی کے ہاں اولاد کی آمد ہوئی
کوئی مرض الموت میں گرفتار ہوا، کہیں شادی رچی، کہیں کفن
تیار ہونا شروع ہوا، اور ان کی من مانی مراد پوری ہوئی، اللہ
نے اُن کی سُن لی۔

بوا میں ایک اور نہایت دلچسپ وصف ہے، ہر جنگ اُن کے لئے پیام مسرت ہے، نوید جانفزا ہے، عید کا چاند ہے، بھائی بھائی کی تو تو میں میں، ساس بہو، باپ بیٹے، دیورانی، جٹھانی کی جنگیں، سب ان کی رُوح میں بالیدگی پیدا کرتی ہیں، لیکن ان کو سب سے زیادہ توانائی، اور فرحت میاں بیوی کی جنگ سے حاصل ہوتی ہے، کہیں جنگ کا سلسلہ شروع ہوا اور وہ آ پہونچیں بظاہر صلح و آشتی کی پیامبر بن کر آتی ہیں لیکن دل ہی دل میں دعائیں مانگتی ہیں کہ جنگ اور طول پکڑے اور زیادہ ہنگامہ برپا ہو، اور زیادہ کشت و خون ہو، جنگ نے پلٹا کھایا، صلح کی بات چیت شروع ہوئی، اور ان کی آرزوؤں پر اوس پڑی، وہ چپ چپاتے ایسی غائب ہو جائیں گی کہ گویا اس گھر میں آئیں ہی نہ تھیں، جب تک جنگ جاری رہے گی، تب تک جانبین سے برابر ملتی رہیں گی، اور ایک کے خلاف دوسری جماعت کو اس طرح بھڑکائیں گی کہ دونوں جماعتیں ان کو اپنا اپنا رفیق سمجھتی رہیں گی، حالانکہ ان کو ان جماعتوں سے تو کیا شاید اللہ سے بھی رفاقت نہیں ہے، میاں سے بیوی کی بُرائی، بیوی سے میاں کی بُرائی، ساس سے بہو کی، اور بہو سے ساس کی برائی، بھائی

سے بہن کی، اور بہن سے بھائی کی بُرائی کرنے میں وہ اِس قدر اُستاد ہیں کہ اب اُن کا کوئی ہمسر دنیا میں باقی نہیں رہا،

دیکھئے، دیکھئے، وہ آپہنچیں، بوا بُندہ بیگم کی چال ملاحظہ ہو، کتراتی، اٹھلاتی، دہنِ مُبارک سے پھول برساتی .... کچھ گنگنا بھی رہی ہیں .... کیا خوب!

"چلے ایسے کہ محشر بپا کر چلے ..... چلے ..... ایسے" ......

وہ آہی گئیں، میں تو جناب! رخصت ہوتا ہوں۔

مولوی

ہمارا مولوی پیشہ کے اعتبار سے مولوی نہیں ہے، بلکہ بالطبع، بالخواص، بالخصوص مولوی ہے، ہندوستان کا ایم۔ اے اور ولایت کا پی۔ ایچ۔ ڈی ہے۔ نہایت ذہین، طباع، اور ایک حد تک برخود غلط بھی ہے، عِلمیت سے اُن ڈگریوں کے باوجود کوسوں دُور ہے مگر بڑے سے بڑے عالم سے برابر کی ٹکر لیتا ہے، کسی کی برتری کا نہ کبھی قائل ہوا اور نہ ہو سکتا ہے۔

مولوی کی شخصیت سخت گمراہ کُن و نہایت مایوس کُن ہے، یہ اندازہ ہی نہیں ہو سکتا کہ گوشت پوست کے اس مختصر سے ڈھانچہ میں یہ تیزی اور طراری، یہ انانیت، اور الوہیت، یہ

بچ دھج اور اُٹھ موجود ہو سکتی ہے، قد و قامت میں مولوی پانچویں درجہ کا طالب علم معلوم ہوتا ہے، لیکن اُفتادِ طبیعت کے اعتبار سے مولوی چوبیس گھنٹوں میں کم از کم سولہ گھنٹہ، ایڈین ٹ یا "ہیرو" کا ہیڈ ماسٹر ہے، اور تو اور مولوی دوستوں کے مجمع میں بھی بیٹھ کر ہیڈ ماسٹری کرتا ہے، اور اس کے دوست اِس کے اس اندازِ مجنونانہ پر ہزار جان سے عاشق ہوتے ہیں، اور اس کو آنکھوں پر جگہ دیتے ہیں۔

اسلام سے بے خبر سہی لیکن اپنے مذہب سے مولوی کو نہایت گہرا لگاؤ ہے، پانچ وقت کی نماز بڑی پابندی سے پڑھتا ہے، روزہ اس کا کبھی قضا نہ ہوگا؛ کسی نے اسلام کی شان میں ذرا بھی کوئی اونچی نیچی بات کہی، اور مولوی برہم ہوا؛ مارنے مرنے پر تیار، اپنی اور دوسرے کی جان ایک کر دینے پر آمادہ نظر آتا ہے، مولوی کو ان "ولایت پلٹ" لوگوں سے سخت کوفت ہے جو ولایت سے واپس آتے ہی ہندوستان سے نفور، اسلام سے بیزار ہو کر ہندوستانی مسلم ہونے کے باوجود ایک اَپ ٹو ڈیٹ انگریز بننے کی مضحکہ خیز اور ناکام

کوشش کرتے رہتے ہیں، علی گڑھ میں اکثر یہ ہوتا رہتا ہے کہ وہاں کے اساتذہ اونچے اونچے امتحانات اور بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کر کے ولایت سے آتے رہتے ہیں، ان میں اکثر ایسے بھی ہوتے ہیں جو آتے ہی لن ترانیاں ہانکنا شروع کر دیتے ہیں، فلاں ڈبیٹ میں میں نے یوں معرکہ کی تقریر کی! فلاں رسالہ میں میرا مقالہ شائع ہوا اور ملک میں اس کے شائع ہوتے ہی دھوم مچ گئی، فلاں جلسہ میں میری تقریر ہوئی اور سامعین میری جادو بیانی پر ایمان لے آئے، غرض ولایت سے جو واپس آتا ہے، وہ بقول خود اپنی "علمیت" کے جھنڈے گاڑ کر واپس آتا ہے، اِن ولایت زدہ افراد نے مولوی کے سامنے دون کی لی، اور مولوی جُز بُز ہوا، کسی نے اپنے پَر تول کر اُڑنے کا ارادہ کیا اور مولوی نے اس کو "پر قینچ" کیا۔ ناممکن ہے کہ اس کے سامنے کسی ولایت زدہ کی "بحث بازی" کا چراغ روشن ہو سکے، مولوی نہایت بے دردی کے ساتھ اُس کے پُرزے اُڑا کر رکھ دے گا۔

• مولوی قد و قامت میں بہت چھوٹا ہے، لیکن اس کا

دل بڑا، اُس کا کلیجہ دو ہاتھ کا، اس کا حوصلہ بلند، اس کی محبّت نہایت گہری اور پائدار، اس کی رُوح وسیع اور پاکیزہ، اس کا اخلاص کندن کی طرح صاف و شفاف ہے،

عزیزوں کی نگرانی غریبوں کی امداد، دوستوں سے محبّت، ملنے جلنے والوں سے مروت، مولوی کے لئے آئے دن کے کام ہیں،

لیکن

ایک انداز شاہانہ، ایک شانِ فقیرانہ، ایک روشِ رندانہ اس کے ہر فعل میں موجود ہوگی، وہ اپنے پرائے پر احسان کرنے سے کبھی دریغ نہیں کرتا، اور اس طریقہ سے پے درپے احسان کرتا رہے گا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی، خوب دھڑلے سے کماتا ہے، لیکن ہر وہ کمائی اس پر حرام ہے جس کے حاصل کرنے میں اس کے وقار کو ذراسی بھی آنچ پہونچے، ترقی کا خواہش مند بھی ہے اور کوشاں بھی، لیکن جو کچھ کماتا ہے وہ دوسروں پر بے دریغ خرچ کر دے گا، خود مفلس ہو جائے گا۔ بالکل قلاش ہو جائے گا، لیکن ماتھے پر شکن تک نہ آئے گی، مولوی کی پونجی اس کے ہم عصروں اور ہم کاروں کے مقابلہ میں کمتر ہے لیکن

اِس کی شانِ بے نیازی، اِس کا اندازِ استغنا سب سے بڑھا ہوا ہے بڑے سے بڑے افسروں کے سامنے جہاں اوروں کے پَر جلتے ہیں، مولوی بے باکانہ گفتگو کرنے کا عادی ہے، اسی لئے اس کے دوستوں کا خیال ہے کہ مولوی کا افسر بننا دُنیا میں سب سے مُشکل کام ہے، وہ اپنا کام پوری محنت اور دیانت داری کے ساتھ کرتا ہے، افسر کے خوش رکھنے کو وہ فرض منصبی نہیں گردانتا، افسر نے ذرا بے کارسی افسری کا انداز اختیار کیا اور مولوی نے اِس کے پندارِ تمکنت کے پُرزے اُڑانا شروع کئے، پھر جب تک وہ اِس تمکنت کو خاک میں نہ ملا لیگا اُسے ہرگز چین نہ آئے گا؛ چاہے اس سعی میں خود فنا ہو جائے

مولوی کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت اُس کی ڈانٹ پھٹکار ہے؛

وہ اپنی طبیعت کی اُفتاد سے مجبور ہے، مُحبت کرے گا تو ڈانٹتے ہوئے، کسی پر الطاف و اکرام کی بارش ہو گی تو پھٹکار کے ساتھ، اسٹیشن پر آپ کو لینے آئے گا تو آپ کو ڈانٹے گا؛ اودھر ریلوے ملازمین پر الگ لے دے کرے گا؛ آپ کے بچہ کو

گود میں لے گا، اُسے چمکارے گا، پیار کرے گا، لیکن اُسی کے ساتھ ساتھ آپ کو ڈانٹ ضرور "پلاتا" رہے گا، مولوی کی ڈانٹ اغلباً اس کے دوستوں کو اس وجہ سے محبوب ہے کہ اس میں نہ تلخی ہوتی ہے اور نہ انتقام ہوتا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس ڈانٹ میں اخلاص کا رس اور محبت کی چاشنی ہوتی ہے، اُس کے دوست اُس کی ڈانٹ سُنتے جاتے ہیں اور اُسے گلے لگاتے جاتے ہیں۔

مولوی بہت کچھ برداشت کرسکتا ہے، لیکن اس کی یہ ایک خاص کمزوری ہے۔ اغلباً یہ اُس کی مولویت ہے کہ وہ "مغرب زدہ عورت" کو کسی عنوان سے برداشت نہیں کرسکتا، حوا کی اِن بیٹیوں کو وہ "قیامتِ صغریٰ" کے نام سے یاد کرتا ہے، اس قسم کی کوئی بے باک سی عورت مولوی کے سامنے آئی اور مولوی کے ہوش و حواس پراگندہ ہوئے، نفرت اور حقارت کی دہکتی ہوئی آگ جو اِن عورتوں کو دیکھ کر اس کے کلیجہ میں مشتعل ہونے لگتی ہے اس کو قابو میں رکھنا بذات خود ایک بہت بڑی مہم ہے، اس پر اگر اس عورت نے انگریزی بولنا شروع کردی تو گویا۔

سمندِ ناز پر اک اور تازیانہ ہوا، مولوی انگریزی بولنے پر بہت کم قادر ہے، یہ ضرور ہے کہ اُس کی زبان گردن پر پڑی ہے، وہ اُردو میں بے تحاشا بڑے سے بڑے مجمع میں تقریر کرتا ہے، عربی بے تکان بولتا ہے، فارسی میں بے تکلف گفتگو کر سکتا ہے، لیکن جہاں انگریزی بولنے کی ضرورت ہوتی ہے وہاں مولوی بغلیں جھانکتا ہے اغلباً اس خامی کی وجہ یہ ہے کہ وہ انگریزی میں ڈانٹنا، پھٹکارنا نہیں جانتا، اور ڈانٹ پھٹکار کے بغیر وہ بات کرنے سے قاصر ہے،

مولوی رائفل سے شکار کھیلتا ہے، انگریزی کے خطوط ٹائپ کرتا ہے، تاش سے نفرت کرتا ہے، شطرنج خوب مزے لے لے کر کھیلتا ہے، چاء پیتا رہتا ہے، پان کھاتا رہتا ہے، چاء پلاتا رہتا ہے پان کھلاتا رہتا ہے، مزے دار لطیفے اور چٹکلے سناتا رہتا ہے، خوب ہنستا ہے خوب ہنساتا ہے اور وقتاً فوقتاً تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ڈانٹتا پھٹکارتا بھی رہتا ہے۔ سنجیدہ لمحات میں اس سے زیادہ عزیزوں کا غم گسار، اس سے زیادہ دوستوں کا وفا شعار، اِس سے زیادہ یاروں کا یار

ملنا دشوار ہے؛

لکھنے کو تو ہم یہ سب کچھ لکھ گئے لیکن دل میں دھڑکن ہو رہی ہے کہ کہیں مولوی نہ آکودے اور لگے ڈانٹنے پھٹکارنے، اور اول فول بکنے ....

ط-ظ

عمر میں سوا سال، ڈیڑھ سال کا فرق ہوگا۔ اگر طؔ گیارہ برس کی ہے تو ظؔ ساڑھے بارہ برس کی ہوگی، مگر بلا کی سوکھی، بیمار صورت اور ناتواں، ظ سے کچھ چھوٹی ہی معلوم ہوتی ہے۔ ط پہلے تو ذرا موٹی تھی مگر ادھر سال دو سال سے سوکھتی جا رہی ہے پھر بھی موسم کی تبدیلیوں اور جاڑے گرمی کی سختیوں کو آسانی کے ساتھ برداشت کر سکتی ہے، مگر غریب ظؔ اس قدر ناتواں ہیں کہ ذرا ٹھنڈی ہوا چلی اور وہ پلنگ پر لیٹیں، ذرا سورج کی تپش میں اضافہ ہوا اور ان کا چہرہ تمتما اُٹھا۔

دونوں بچیاں ایک انگریزی اسکول کے آٹھویں درجہ

میں تعلیم پا رہی ہیں اور ہر سال اچھے نمبروں سے پاس ہوتی جا رہی ہیں، ط کلاس میں اوّل ہے، انگریزی میں اوّل حساب میں سب لڑکیوں کے آگے، ہمیشہ سو میں سو نمبر پاتی ہے اور گھنٹوں حساب کے سوالات بڑے ذوق وشوق کے ساتھ نکالتی رہتی ہے،
ظ ذہین ہے، مگر تھوڑی سی محنت سے اُکتا جاتی ہے، سینا اچھا ہے لیکن آدھ گھنٹہ سے زیادہ کبھی نہ سیئے گی، گاتی اچھا ہے لیکن ایک غزل بھی پورا کرنا اُسے دوبھر ہو جائے گا، چونکہ بے حد لاغر، اور کمزور ہے اس لئے اپنی خواندگی پر پوری توجہ نہیں دے سکتی، پھر بھی سکنڈ ڈویزن کے نمبر حاصل کرتی ہوئی پاس ہو جاتی ہے،

ط۔ ظ ایک دوسرے کی سگی بہنیں ہیں، ایک ہی گھر میں پرورش پا رہی ہیں، ایک ہی کتابیں پڑھ رہی ہیں، ایک ہی اسکول میں تعلیم پا رہی ہیں، ایک ہی ماحول میں زندگی گذار رہی ہیں، مگر دونوں کی طبیعتوں اور رجحانات میں زمین آسمان کا فرق ہے،

ایک اگر انگریز ہے تو دوسری ٹھیٹ ہندوستانی، ایک

تورانی ہے تو دوسری ایرانی، ایک عربی ہے تو دوسری عجمی، ایک کانگریسی ہے تو دوسری مُسلم لیگی،

ظ صبح بہت دیر میں بیدار ہوگی، بڑے انداز سے، بڑے تکلف سے ناشتہ کرے گی، اس کے بعد ان کا منھ ہاتھ دُھلے گا کنگھی چوٹی ہوگی، کپڑے بدلے جائیں گے، باریک سے باریک کُرتہ اُن کو مرغوب ہے، دوپٹہ اگر چُنا ہوا نہیں ہے تو اُسے سر پہ ڈالنا وبالِ دوش ہو جائے گا۔ کپڑے اگر ان کی مرضی کے ہاتھ نہ لگے تو اوروں کے بکسوں پر چھاپہ مارا جائے گا، اور اپنی دسترس میں جو بہتر سے بہتر کپڑے ہوں گے، وہ ذوق وشوق کے ساتھ پہنے جائیں گے، جب وہ اپنی مرضی کے کپڑے پہن لیں گی اور ایک آدھ دفعہ رو دُھو بھی لیں گی تب اپنے کپڑے دکھانے اور اخلاقی تعلقات قائم رکھنے اپنی چچی جان کے پاس کوٹھے پر جائیں گی، اُن کے وہاں پہنچتے ہی نیچے کا شور کم ہو جائے گا۔ اور اسی مناسبت سے کوٹھے پر شور زیادہ ہونے لگے گا،

کسی کو چھیڑ رہی ہیں، کسی کا مُنھ چڑھا دیا؛

کسی کے گلے میں باہیں ڈال دیں،

کسی سے جنگ پر آمادہ ہیں، ادھر اسکول کی لاری دروازہ

پر" ہارن" دے رہی ہے، مگر اس شور میں کان پڑی آواز تک نہیں سُنائی دیتی،

اس کے برخلاف نہ کسی نے یہ دیکھا کہ طالب کب منہ دھویا کب ناشتہ کیا، کب کپڑے بدلے، لاری کے ہارن پر کتابیں ہاتھ میں لئے اور بُنائی کی اُون اور تیلیاں، اپنی بغل میں دبائے دروازے پر موجود ہیں، سر پر سفید دُھلا ہوا سادہ سادہ دوپٹہ ہے، اور چہرہ پر سوائے ایک سکون مطلق کے اور کوئی جذبہ نہیں ہوتا؛ نہ ہنسی، نہ خوشی، نہ رنج نہ اکراہ، جس قدر ظ جذبات کے معاملہ میں سرسبز اور شاداب ہے اسی قدر ط کے ہاں جذبات کا فقدان، یکسر فقدان ہے، بعض وقت تو طبیعت میں سخت الجھن پیدا ہوتی ہے کہ آخر اس کم عمر سی ط میں اس بلا کی متانت اور سنجیدگی کیوں آگئی؛

بڑے سے بڑا واقعہ جو دُنیا کے جذبات میں ایک طوفانِ عظیم پیدا کر دے، ط کی متانت میں ذرا سی بھی جنبش پیدا نہ کر سکے گا۔

مہمانوں سے گھُل مل کر باتیں کرنا، آئے گئے کی خاطر تواضع

کرنا، آنے جانے والوں کا آگا تاگا کرنا۔ بچوں کو گود میں لینا، چمکارنا، پیار کرنا، اپنی ہم عمر لڑکیوں کے کلیجہ تک میں پیوست ہو جانا، ڈاک میں اپنے رسالوں، اخباروں اور اپنی سہیلیوں کے خطوط کا انتظار کرنا، پھر اُن کو پڑھنا، خاص اہتمام اور شور و شغب کے ساتھ اُن کا جواب دینا جس ترتیب اور جوش و خروش کے ساتھ ظ کرسکتی ہے اس عمر کی اور کوئی لڑکی نہیں کرسکتی، دوستی پیدا کرنے میں جو اُن کو ملکہ حاصل ہے وہ شاید بڑوں بڑوں کو نصیب نہ ہوگا، اپنی اماں بی (یعنی دادی صاحبہ) سے اُن کی دوستی، اپنے چچا جان کے گلے کا وہ ہار، اپنی چچی جان کی وہ شیدائی، اپنی چچی جان کے دربار میں جو قربت اُن کو حاصل ہے وہ بڑے سے بڑے صوفی باصفا کو اپنے مرشد کے دربار میں بھی نہ ہو گی،

ہمارے گھر میں جس نے قدم رکھا وہ یقیناً سب سے پہلے یہ پوچھے گا کہ ظ کہاں ہے، ظ مہمانوں کو چار پلاتی اور مزے دار پان کھلاتی ہے، اور ظ کسی کونے میں بیٹھی اقلیدس کی کوئی شکل حل کرتی رہتی ہے یا کسی کے سوئٹر کے بُننے میں اس قدر محو ہوگی کہ اُسے دین و دُنیا کی خبر نہ ہو گی، وہ اس قدر بے نیاز ہے کہ نہ

آنے والے کی آمد سے خوش ہوتی ہے، اور نہ جانے والے کی رخصت ہونے سے رنجیدہ،

اس کے برخلاف ہر شخص کے رخصت ہوتے وقت ظ کا دوپٹہ کے پلّو سے آنکھیں پوچھنا اور پنسل سے ایک پُرزے پر اس کا پتہ مقام لینا ازبس ضروری ہے،

اسی وجہ سے ظ اسکول میں نہایت ہردل عزیز ہیں اور ط کا نام بھی کوئی نہیں جانتا؛

عمر میں چھوٹی ہیں لیکن قد بہت لمبا ہو گیا ہے، اسی وجہ سے اب ظ کو یہ خیال ہونے لگا ہے کہ اب میں بڑی ہو گئی ہوں،

مدت سے اُن کو یہ فکر دامنگیر تھی کہ میں خدا کرے جلد بڑی ہو جاؤں، اب بڑی عورتوں میں اس طرح بیٹھتی ہیں کہ گویا اِن کا بھی اُن میں شمار ہے، باتیں بھی معقولیت سے کریں گی، اس سے زیادہ معقولیت سے باتیں سُنیں گی، پان خود بھی کھائیں گی اور دوسروں کو بھی کھلائیں گی، ذرا موقعہ ہوا تو لیٹ بھی جائیں گی، کیونکہ اِن کی ناتوانی کی وجہ سے اُن کو لیٹ جانے کی ہر جگہ اجازت دی جا چکی ہے، ہر آنے والی سے بیحد شیر و شکر ہیں، کوئی

گھر میں داخل ہوا اور اُن کے لئے بہار آگئی، میزبانی کے فرائض بڑی ترتیب اور ہوشمندی کے ساتھ ادا کرنا شروع کر دینگی، بہت جلد بے تکلف ہو کر محبت کے عہد و پیمان کر لیتی ہیں، دوسروں کو کھلاتی خوب ہیں، کھاتی ہیں خود بھی، مگر دوسرے انداز سے، ان کا خیال ہے کہ میں اولاد کبریٰ ہوں، سب سے زیادہ خوبصورت اولاد ہوں، بیمار ہوں اس لئے گھر بھر کے سارے توس، مکھن، دودھ انڈے، حلوے، میرے ہیں، مجھ سے اگر بچے تو دوسرے کو ملے، مساوات کی وہ قائل نہیں، نہایت ناوقت اُٹھ کر باورچی خانہ کا رُخ کریں گی، تھوڑی دیر میں معلوم ہوگا کہ گھر کا معمولی کھانا بھی ظ کو ناپسند ہے اس لئے چاء تیار کی جا رہی ہے اور انڈے ابالے جا رہے ہیں، اُس پر یہ ستم ہے کہ کوئی شخص اُن کی چاء اور انڈوں پر نگاہ نہ ڈالے، ورنہ وہ حشر برپا کر دیں گی اسکول سے واپسی کا وقت ظ کے لئے بڑا جاں کنی کا وقت ہوتا ہے، لاری سے وہ اُتریں اور اُنھوں نے بسورنا شروع کر دیا: ان کا ذہنی مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ آؤ، میرے قدم لو، میرے پیر چومو کہ میں اسکول ہو آئی یہ میرا ہی جگر تھا کہ میں نے یہ معرکہ سر کیا، افسوس ہے کہ اس وقت گھر میں کوئی ملتفت نہیں ہوتا، وہ خود بسورتی ہوئی، ٹھنکتی ہوئی نعمت خانہ تک

پہونچیں گی، اور کھانے کا جو بہتر سے بہتر سامان ہوگا وہ خود جب تک نہ کھا لیں گی اُس وقت تک اُن کا چہرہ بشاش نہ ہوگا، اس کے بعد پھر چا، ہو گی، انڈے ہوں گے، اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہیگا جب تک کہ اُن کے بھائی صاحب کالج سے واپس نہ آجائیں گے اور وہ بھی آکر روزانہ یہی دیکھیں گے کہ بغیر کپڑے بدلے نظ چوڑھے پر جھکی ہوئی ہے، اور ط کپڑے بدل کر "چکرورتی" پر اوندھی پڑی ہے۔"

حافظ جی

ان کی عمر پچاس سے کچھ ہی کم ہوگی، لیکن صورت شکل سے تیس بتیس برس کے نوجوان معلوم ہوتے ہیں، ہندوستان کے یہ اُن مخصوص لوگوں میں سے ہیں جو بوڑھے ہونے سے انکار کرتے رہتے ہیں اور اپنی قوت ارادی کے بل بوتے پر جوان بنے رہتے ہیں، حافظ جی کے خیال میں بوڑھا ہونا "اعتراف شکست" ہے، حافظ جی شکست کھانے کے لئے کسی طرح تیار نہیں ہیں، نہ اب ہیں۔ اور نہ کبھی بچپن میں ہوئے؛ اس وجہ سے سدا بہار، جوان، جوان ہی نہیں بلکہ بلا مبالغہ اب تک نوجوان بنے ہوئے ہیں، کوئی دوا دارو نہیں کھاتے عمدہ غذائیں اُن کو میسر نہیں،

رہنے کے لئے عمدہ پُر تکلف مکان نہیں، نہ کوئی خدمت گار ہے، نہ سواری ہے، نہ شکار ہے، کوئی خاص ورزش نہیں بجز اس کے کہ معمولی طور سے چلتے پھرتے رہتے ہیں، لیکن ایک آہنی قوتِ ارادی ہے، عزم بالجزم ہے، اور خیال پر پختگی سے جمے ہوئے ہیں، اسی کی بدولت جوان، سراسر جوان بنے ہوئے ہیں، اور ہمیں یقین ہے کہ ہمیشہ بنے رہیں گے، اور عناصر پر اُن کی فتحمندی ایک "پھنکار" کی صورت میں قائم رہے گی؛

مشن روڈ پر ایک پُرانی مگر غیر تاریخی مسجد واقع ہے، اس کی پُشت کا خم سڑک تک آجاتا ہے، اسی جگہ ایک بہت چھوٹی سی نہایت تنگ سی کوٹھری نما دکان ہے، جس کے آگے ایک گز چوڑا اور شکل سے دو گز لمبا ایک چبوترہ ہے، اس کوٹھری میں اور چبوترے پر حافظ جی سرمہ کی دوکان رکھے ہوئے ہیں، چبوترے پر سفید چاندنی بچھی ہے، بیچ میں حافظ جی بیٹھے ہوئے جھومتے اور پھنکارتے رہتے ہیں ان کے یمین و یسار سرمہ کی چھوٹی سی ہری ہری اور سفید سفید پڑیاں، لکڑی اور پیتل کی سرمہ دانیاں نہایت قرینہ اور صفائی کے ساتھ رکھی ہوتی ہیں اور ہمیشہ

رکھی ہی رہتی ہیں، لیکن حافظ جی کا جھومنا اور پھنکاریں لینا ایک ایسا سلسلہ ہے جو کبھی نہ ختم ہوا ہے، اور نہ ہو گا۔

ہمیں حافظ جی سے پچیس سال سے واقفیت ہے، ایک زمانہ میں روزانہ کئی کئی گھنٹہ کے لئے زیارت ہوتی تھی، اس زمانہ میں وہ ہمارے ہاں کے بچوں کو قرآن پاک پڑھایا کرتے تھے ایک ایسے مکتب کے ہیڈ مولوی تھے جہاں درس نظامی کے اصول پر چھوٹے چھوٹے بچوں کو تعلیم دی جاتی تھی، آج کل بھی تقریباً روزانہ مسٹن روڈ پر آتے جاتے ان کی زیارت ہو جاتی ہے، مگر خدا علیم ہے نہ کبھی ان کے جسم اطہر کو ساکت دیکھا، اور نہ کبھی مولوی صاحب کی ناک کے نتھنے اپنے دائمی شغل سے باز آئے،

وہی جھومنا، وہی بل کھانا، اور وہی پھنکارنا، وہی غرّانا، خدا کو منظور ہے تو بستر مرگ پر بھی یہ ہی جھومنا ہو گا، اور یہ ہی پھنکار ہو گی؛

اس " پھنکار کے ایک نفسیاتی معنی ہیں، اور ہمیں یقین ہے کہ ہم نے ان معنوں کے سمجھنے میں غلطی نہیں کی ہے، ہر وہ شخص جو اس طرح پھنکارتا ہے وہ یقیناً دنیا داروں پر ایک حقارت آمیز نفرت

کی نظر ڈالتا رہتا ہے،

دنیا ہیچ، دنیا والے ہیچ، آسمان و زمین بے اصل، دنیا میں پھیلنے والی تحریکات مہمل، اب رہ گیا کیا بجز نام اللہ کے ؟

جس زمانہ میں حافظ جی ہمارے محلہ میں بچوں کو پڑھایا کرتے تھے اس زمانہ میں اُن کی پھنکار آسمان تک پہنچتی تھی، وہ بچوں کو مارنے پیٹنے کے قائل نہ تھے، مارے تو وہ جس کی پھنکار میں دم نہ ہو، ویسے تو جھومنا اور پھنکارنا اُن کا کبھی ختم نہ ہوا لیکن غیظ و غضب کی حالت میں ان جذبات کی شدت کی نسبت سے جھومنا اور پھنکارنا، اور زیادہ تیز، اور زیادہ ہیبت ناک اور ہوشربا ہو جاتا تھا، غریب بچے اور بچیاں محض جھومنے اور پکارنے ہی سے خستہ حال اور پراگندہ حواس ہو جاتے۔

اس میں شک نہیں کہ وہ حافظ قرآن کی حیثیت سے نہایت کامیاب ہیں، بہت اچھا یاد ہے، یاد پر عبور ہے، تلاوت ہمیشہ پابندی سے کرتے رہتے ہیں، بے تکان پارے کے پارے پڑھ جاتے ہیں، نہ غلطی کا امکان، اور نہ تشابہ کا موقعہ لیکن حافظ جی تراویح ایک خاص انداز سے پڑھتے ہیں۔ آپ نے کوئی ایسا پبلک اسپیکر بھی دیکھا ہے جو تقریر بھی کرتا جاتا ہو اور

صدارت کے فرائض بھی انجام دیتا رہتا ہے، تقریر بھی جاری ہے، اور جلسہ کی ترتیب و نظام بھی قائم رکھا جا رہا ہے، یہی حالت حافظ جی کے قرآن خوانی کی ہے، تراویح بھی پڑھتے ہیں اور اپنے جھومنے اور پھنکارنے سے مسجد میں نظم بھی برقرار رکھتے ہیں، مسجد میں کوئی شخص دیر سے داخل ہوا، اور حافظ جی پھنکارے، کسی نے کوئی اور بدتمیزی کی، اور حافظ جی جھومے اور غرّائے، ہمارے دوست کسی سامع کے بھی قائل نہیں ہیں، اُن کے نزدیک یہ بھی "اعترافِ شکست" ہے، اور آپ کو معلوم ہے کہ ان کا کام و دہن شکست کی لذت سے، محرومی کے ذائقہ سے اور نامرادی کے چٹخارے سے ہمیشہ سے ناآشنا ہے۔

حافظ جی کی قرآن خوانی کی تعریف کیجیے، وہ اِس تعریف کو اپنے رجسٹر میں نوٹ کرلیں گے، لیکن اس تعریف و توصیف کا اعتراف ہرگز نہ کریں گے، یہ اعتراف بھی اُن کے خیال میں اعترافِ شکست ہے!

حافظ جی سلام بھی ایک عجیب طریقہ سے کرتے ہیں، ڈانٹ کر، پھنکار کر، غرّا کر سلام کرتے ہیں اور اُن کا مدِ مقابل نہایت ادب سے سلام لینے پر مجبور ہو جاتا ہے،

مثل مشہور ہے کہ ایک مرتبہ یہودی بن کر پھر یہودیت سے
ہاتھ دھو لینا سراسر ناممکن ہو جاتا ہے، اسی طرح ایک مرتبہ حافظ
جی سے تلمذ اختیار کیا، اور عمر بھر کے لئے آپ؛ آپ کی اولاد،
آپ کے عزیز، اور پڑوسی، اور آپ کے احباب اور شناسا
سب آپ کے ایک سبق کے لیتے ہی حافظ جی کے شاگرد رشید
ہو گئے، آپ اپنی زندگی کے کسی دور میں چاہے شاگردیت کے
جذبات اپنے دل سے نکال دیں، لیکن حافظ جی اپنی "استادیت"
نہ کبھی خود بھولیں اور نہ آپ کو بھولنے دیں؛ دس برس کے بعد
بھی اگر آپ حافظ جی سے ملیں وہی ڈانٹ پھٹکار ہوگی اور
بالکل وہی جھومنا ہوگا، وہی پھنکارنا، اور غرّانا،

ہم نے یہ دلچسپ مناظر بارہا دیکھے ہیں، لیکن ان مناظر
کو دیکھ کر ہم ہمیشہ اسی نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ شاگردیت کے سامنے
حافظ جی کی دل داری، آواز کی نرمی، اور جذبات کی
ہمدردی کو سراسر ہیچ اور ناکارہ سمجھتے ہیں، ہم نے گذشتہ
پچیس سال میں حافظ جی کو کبھی "رقیق" ہوتے ہوئے نہ دیکھا
اغلباً یہ نرمی ان کے نزدیک اعترافِ شکست ہے، اور آپ
کو معلوم ہے کہ شکست کے بارے میں حافظ جی کی پھنکار کس قدر

زہرآلود اور غضب ناک ہوتی ہے۔

ہمیں خود حافظ جی کی شاگردی کا شرف کبھی حاصل نہ ہوا، ہم صرف اُن کے چند شاگردوں کے قریبی عزیز ہیں، اس لئے ان کے خاص فلسفہ کی رُو سے ہم بھی اُن کے شاگردوں کے زمرہ میں داخل ہوئے۔ لیکن اپنی روح کی پوری قوت کے ساتھ ہمیں اس ناجائز رشتہ کی مخالفت کرتے ہوئے کم سے کم پندرہ سال گزر چکے ہیں، آج کل یہ مخالفت بڑی شدت کے ساتھ چل رہی ہے، ہم نے عہد کر لیا ہے کہ ہم حافظ جی کو نہ پہچانینگے اور نہ اُن کو سلام کریں، اور نہ اُن کی طرف دیکھیں کہ اُنکی پھنکار ہم سے ایک مؤدبانہ سلام وصول کر سکے، ہم اپنی سائیکل پر ایک شانِ استغنا، ایک اندازِ بے اعتنائی اپنے چہرہ کے ارد گرد نخوت، غرور، اور تمکنت کی ایک حقارت آمیز فضا لئے ہوئے دن میں دو مرتبہ حافظ جی کی دوکان سے گزرتے ہیں، علیک سلیک بالکل بند، اُنھوں نے ہم پر نظر ڈالی، ہم نے آسمان کو دیکھا، اُنھوں نے آسمان پر نظر جمائی، ہم نے حافظ جی کو تاکنا شروع کر دیا، ہم نے اِن کو پہچاننا بالکل بند کر دیا ہے، اسی وجہ سے ہماری سائیکل کی

آہٹ پاکر اِن کا جھومنا اور پھنکارنا شدید تر ہو جاتا ہے، اور وہ اس دن کا انتظار کر رہے ہیں کہ جب ہماری گردن اُن کے ہاتھ میں ہوگی، اور ہمیں مارتے مارتے وہ ادھ مرا کر چکے ہوں گے،

یہ فرعونیت، یہ انانیت، اُن کے کسی شاگرد سے آج تک سرزد نہیں ہوئی، ہمارا رویہ ان کے احساسِ پندار پر ایک کاری ضرب ہے، لیکن ہمارے نزدیک ان کی شاگردی "متعدی" نہیں ہے، اس لئے ہم اس وبا کا مریض اپنے آپ کو کیوں سمجھنے لگیں، ——— غرور کی کش مکش ہے، نخوت کی جنگ ہے، بغایت دل کش، اور بہایت معصومانہ، دیکھئے کس کے ہاتھ بازی رہتی ہے؟

حافظ جی میں ایک اور کمال ہے، اس کمال کا اعتراف ہم دل کھول کر کرنے کے لئے تیار ہیں، گھڑی کے وہ کبھی قائل نہ ہوئے، لیکن وقت کا اندازہ جس قدر صحیح حافظ جی کر سکتے ہیں ہم نے کسی کو کرتے نہ دیکھا"

"جناب! کیا وقت ہوگا؟"

"دو بج کر دس منٹ آئے ہوں گے"

حافظ جی کی زبان سے یہ کلمے نکلے اور قریب کی گھڑی پر یہ لازم ہوگیا کہ وہ دو بج کر دس منٹ بجائے، اور پھر ایک اور کمال ہے، آسمان پر جس قدر ابر محیط ہوتا جائے گا اسی قدر صحت اور صفائی کے ساتھ وقت کے بارے میں حافظ جی کا اندازہ صحیح سے صحیح تر ہوتا جائے گا۔ ہمارے دوست کے اس کمال کو ہر شخص خواہ ان کا سلامی ہو یا باغی ضرور مانتا ہے، بعض خوش عقیدہ اور سن رسیدہ بزرگوں کا تو یہ خیال ہو چلا ہے کہ حافظ جی کے قبضہ میں کوئی جن ہے؛ ورنہ وہ ہرگز نہ اس قدر جھومتے، پھنکارتے اور نہ اس قدر صحت کے ساتھ وقت بتا سکتے؛

ہمارے دوست کو حفظِ مراتب کا بے اندازہ احساس ہے اس خیال نے ان کے دل و دماغ پر پورا پورا تسلط حاصل کر لیا ہے، دنیا والوں کو اُنھوں نے تین حصّوں میں تقسیم کیا ہے، ایک طبقہ میں حکام بالا دست آتے ہیں، ڈپٹی، تحصیلدار، داروغہ کوتوال، دوسرے طبقہ میں حافظ جی کے شاگرد؛ شاگردوں کے عزیز اور پڑوسی، اور تیسرے طبقہ میں باقی سارے دنیا والے، دنیا کو ان حصّوں میں تقسیم کرنے کے بعد تعلقات قائم کرنے

یٰں حد درجہ آسانی ہو جاتی ہے، تیسرے درجہ سے بے تعلق افسروں سے پھنکار آمیز، عجز و نیاز، اور شاگردوں سے محض پھنکار اور پھنکار، سراسر غیظ و غضب، اور ہر طبقہ سے ملتے وقت جھومنا بل کھانا اور تھرکنا،

آخر حافظ جی فانی انسان ہی ہیں، افسروں سے بہت جلد مرعوب ہو جاتے ہیں، اور مرعوب ہوتے ہی کم از کم تھوڑی دیر کے لئے ان کے جھومنے اور پھنکارنے میں ایک بے آہنگی اور بے ترتیبی پیدا ہو جاتی ہے، جس افسر نے ان سے سیدھے منھ بات کر لی اُس کے اخلاق حسنہ کے گیت جا بجا گائیں گے، جس نے ان کا خندہ پیشانی سے سلام لے لیا اُس کی پاک بازی کے چرچے کرتے رہیں گے،

غور جہ یں شاید کسی منصرم یا منصف کے ہاں بچوں کو پڑھا چکے ہیں اُن کے نزدیک وہ بزرگ عنقریب مدراس ہائی کورٹ کے جج ہونے والے ہیں،

ایک داروغہ کے چند چھوٹے عزیزوں کو پڑھایا تھا، ان کے خیال میں کوئی دم ہی جاتا ہے کہ وہ داروغہ بمبئی کے پولیس کمشنر ہوں گے، واللہ اعلم بالصواب۔

خدا کا شکر ہے کہ حافظ جی کے علم کا دائرہ محدود ہے، صرف قرآن پاک کے حافظ ہیں اور بہت اچھے حافظ ہیں، اس کے آگے ہمارے خیال میں علم کی کوئی اور شاخ اُن کی شرمندۂ احسان نہیں، نہ اُن غریب کو علم کے بارے میں کسی قسم کا مغالطہ، عادت سے بھی کم گو ہیں، ساری قوت جھومنے اور پھنکارنے میں صرف ہو جاتی ہے، دنیا کی چال ڈھال اور دُنیا والوں کے رنگ ڈھنگ کا مطالعہ ان کا شغل محبوب ہے، لیکن ہمیں اس کے باور کرنے میں سخت تامل ہے کہ وہ آیا نتائج مرتب کرنے، استدلال کرنے، اصول اخذ کرنے اور اسباب و اثرات کا سلسلہ قائم کرنے کی قابلیت بھی رکھتے ہیں یا نہیں؟ اگر یہ قابلیت آپ میں موجود نہیں تو پھر ہزار سال تک دُنیا اور دُنیا والوں کا مشاہدہ کرنا ایک فعل عبث ہے!

کل علی الصبح ہم اپنی سائیکل پر جا رہے تھے، ایک طرف سے پھنکارنے اور غرّانے کی آواز آئی، .... دیکھا کہ حافظ جی لپکتے ہوئے جا رہے ہیں .... اُن کی گود میں ایک شیر خوار بچہ تھا، جو صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کے اثر

سے اور موٹروں اور گاڑیوں کی آوازیں سُن سُن کر ہنس رہا تھا لیکن حافظ جی کے نزدیک اس معصوم بچّہ کا وجود ایک "زندہ اعترافِ شکست" تھا،

وہ اِس غریب پر بے اندازہ پھُنکار رہے تھے، اور غرّا رہے تھے، .... مگر بچّہ اور زیادہ ہنستا تھا، کھِل کھلاتا تھا،

اپنے پھُنکارنے، اور بچّے کے کھِل کھلا کر ہنسنے پر حافظ جی مُسکرا دیئے، میری سائیکل بہت آگے بڑھ چکی تھی؛

داروغہ جی

داروغہ جی کی عمر اب تقریباً پچاس ساٹھ برس کی ہوگی،
بہت زیادہ موٹے تازے لحیم، شحیم، جلد کا رنگ میدہ شہاب
مگر تمام جسم پر کثرت سے مٹیالے اور سفید بدبودار بالوں کے چھتّے
چہرہ مبارک پر سیتلا کے ہلکے دس پانچ داغ، پیٹ بہت اُبھرا
ہوا، باہر کو نکلا ہوا، ٹانگیں قفس کی تیلیاں سمجھئے، مجنوں کی پسلیاں
یا لیلیٰ کی انگلیاں،
اب یہ آپ کی توفیق ہے کہ آپ نازک ٹانگوں کو کیا
سمجھتے ہیں؛
یہ تو داروغہ جی کی ہیئت کذائی ہوئی، شکل و صورت سے

نہایت ہی غیر دلچسپ اور بے کار محض معلوم ہوتے ہیں، کچھ کم تیس سال سرکاری ملازم رہے، پولیس کے سب انسپکٹر، دورانِ ملازمت میں جا بجا تبادلے ہوئے، مختلف اوقات میں ان کے کام کے معائنے ہوئے، کوئی ایسا تھانہ نہ تھا جہاں وہ تبدیل ہو کر گئے ہوں، اور اُن کی موقوفی کا خطرہ نہ ہوا ہو، سوائے موقوفی کے کوئی ایسی سزا نہ تھی جو بارہا اُن کو بھگتنا نہ پڑی ہو، جرمانے ہوئے، تبادلے ہوئے، تنزلی ہوئی، جبریہ رخصت دی گئی، اُن کے خلاف تحقیقاتیں ہوئیں، کمیشن بیٹھے، لائن حاضر رہے، غرض حکومت کے نزدیک کوئی اور ایسی سزا باقی نہ رہی تھی جو ان کو برداشت نہ کرنا پڑی ہو، لیکن قسمت ساتھ دے تو ایسا جیسا کہ داروغہ جی کا ساتھ دیا۔ قبل از وقت پنشن لے کر گھر آ گئے، گھر آتے ہی والد اللہ کے پیارے ہوئے، ڈھائی ہزار روپیہ ماہانہ کی جائداد اور خود اپنی پنشن ان کے حصہ میں آئی، جان بچی لاکھوں پائے! داروغہ جی ٹھنڈے ٹھنڈے گھر کو آئے!

داروغہ جی بیویوں کے بارے میں بہت بدنصیب رہے، تین بیویاں مریں اور تینوں اپنی اولادیں، اپنے شوہر نامدار

کو دیتی چلی گئیں، اب چوتھی بیوی موجود ہیں، اُن سے بھی اُن کے بچے ہیں، ان کا فلسفۂ حیات بالکل انوکھا ہے، اولاد کے معاملہ میں بھی اُن کا ایک خاص نظریہ ہے، ایسا نظریہ جو کہیں دیکھا نہ سُنا، وہ اولاد سے محبت کرنا ایک انسانی کمزوری تصور کرتے ہیں اور اُن کی انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ وہ خود اس کمزوری میں گرفتار نہ ہوں، چنانچہ دیکھنے والے اس کی شہادت دیتے ہیں کہ اب تک دارو غہ جی کا دامن کردار اس دھبّہ سے پاک وصاف رہا، وہ اولاد کو زیادہ سے زیادہ عالمِ وجود میں لا سکتے ہیں اس کے بعد اولاد کا فرض ہے کہ وہ خود تعلیم و تربیت حاصل کرے اور دنیا میں سرسبز ہو یا موت کے گھاٹ اُتر جائے، ان کا ایک غیرت مند بھانجہ خدا جانے کس طرح ام اے۔ ال، ال بی ہوا، بیچارہ پی، سی، ایس میں آچکا تھا کہ روپیہ پیسہ کی قلت اور مجبوری نے اس کے حساس دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے، اور وہ پندرہ بیس ہی روز میں پیوند خاک ہو گیا،

یہ تو کہنا غلط ہوگا کہ دارو غہ جی کو اولاد سے لگاؤ بالکل نہیں ہے، کچھ نہ کچھ لگاؤ تو ضرور ہوگا لیکن اس لگاؤ کے ہر اظہار کو وہ قابلِ نفرت سمجھتے ہیں،

مثلاً باپ اپنے چھوٹے بچوں کو گود میں لیتا ہے، چومتا ہے، پیار کرتا ہے، اُس سے باتیں کرتا ہے، اُس کو گلے لگاتا ہے، وارد غرجی اس کے بالکل قائل نہیں، بلکہ اگر وہ کسی اور شخص کو یہ حرکتیں کرتے دیکھتے ہیں تو دل ہی دل میں اُس کو گالیاں دینا شروع کر دیتے ہیں،

اولاد بڑی ہوتی ہے تو اس کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کیا جاتا ہے، اسکول بھیجا جاتا ہے، اسکول سے پاس ہونے پر کالج میں بھرتی کرایا جاتا ہے، پرائیویٹ ٹیوٹر کی فکر کی جاتی ہے وغیرہ وغیرہ،

وارد غرجی کے نزدیک یہ سب لغو بے معنی، اور نہایت ہی ذلیل حرکتیں ہیں، نہ انھوں نے خود کبھی یہ حرکت کی، اور نہ وہ اِن معاملات میں کوئی اخلاقی، اور مالی امداد دینے کے لئے تیار ہوسکتے ہیں، کم از کم اس معاملہ میں تو اتنے پکّے اور سچّے ہیں کہ کبھی اُن کا عمل اس کے خلاف نہ ہوا،

بھانجہ نے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر امتحانات پاس کئے، کتنا شریف، نیک دل، ہنس مکھ اور علم دوست نوجوان تھا، ادب کا عاشق، تاریخ اور فلسفہ کا شیدائی، اگر زندہ رہتا تو دنیا میں کچھ

کرگزرتا، ان کے پانچ صاحبزادے پڑھ رہے ہیں، دنیا کی سخت اور کٹھن منازل بڑی مردانگی اور ہمت سے طے کر رہے ہیں، داروغہ جی کے نزدیک یہ اوّل درجہ کی لغویت اور سخت ترین حماقت میں گرفتار ہیں؛

اس میں داروغہ جی کی طبیعت کا اس قدر قصور نہیں ہے جس قدر کہ اُن کے ملازمتی ماحول کا. جس میں اُنھوں نے اپنی عمر کے تیس سال بسر کئے، ویسے طبیعت سے بھی خدائیت اور انانیت کا رنگ اُن کے مزاج پر چوکھا چڑھا ہوا ہے، پولیس میں رہنے کی وجہ سے یہ خصوصیت اور زیادہ تیز اور راسخ ہو گئی ہے. اب تک اُن کا یہ خیال ہے کہ وہ داروغہ ہیں، اسی اعتبار سے وہ اپنی بیوی کو اپنا ہیڈ محرر، بچوں کو کانسٹبل، اور محلہ والوں کو اپنی رعیت تصور کرتے ہیں،

ہمارا خیال ہے کہ پولیس والوں کا قہقہہ بھی ایک خاص قہقہہ ہوتا ہے. جس میں اپنے ذاتی تجربے کے ساتھ ساتھ شدت سے وہ طنز آمیز نفرت ملی ہوتی ہے. جس نفرت سے وہ دنیا اور دنیا والوں پر خندہ زن ہوتے ہیں. داروغہ جی کا یہ خاص قہقہہ اُن کا

شاہکار ہے جس پر اُن کو ایک حد تک بڑا ناز ہے، اُن کے نزدیک معاملہ فہمی، سخن سنجی، اور مردم شناسی اُن ہی پر ختم ہے، بالعموم محلہ کے معاملات اور محلہ والوں سے الگ تھلگ رہتے ہیں لیکن اپنی محفل میں علیحٰدہ بیٹھے ہوئے اس شدّ و مد کے ساتھ ہر معاملہ اور ہر شخص پر تبصرہ فرمائیں گے، گویا کائنات کا انتظام و انصرام اُن ہی کے سپرد ہے، اور وہ دنیا کی اُس حقیقت سے واقف ہیں، جو اغلباً ابد تک ایک رازِ سرمدی بنی رہے گی۔

داروغہ جی سخت کاہل، بالکل گُل میخ ہیں، ایک آرام کرسی پر سفید چادر اوڑھے کھدر کی مرزئی پہنے صبح سے دوپہر تک اپنے مردانے میں بیٹھے رہتے ہیں، جتنی دیر باہر بیٹھیں گے سگریٹ اور قہوہ کا دور برابر جاری رہے گا، سُنا ہے کہ قہوہ میں ذرا سی افیون بھی اُن کے ہاں گھولی جاتی ہے، دن کے چوبیس ۲۴ گھنٹوں میں تقریباً ڈھائی تین سیر تمباکو کا دھواں اُن کے نتھنوں میں سے نکل جاتا ہے، ہاتھوں کی ہتھیلیاں اور داڑھی اور مونچھوں کے بہت سے بال تمباکو کے اثر سے پیلے پڑ گئے ہیں، یہ خدا کا شکر ہے کہ داروغہ جی کے باہر آنے کے اوقات

مقرر ہیں، باہر آکر مردانے میں وہ بیٹھتے نہیں ہیں بلکہ وقت مقررہ کے لئے گڑ جاتے ہیں، پیوند زمین ہو جاتے ہیں، انتہا سے زیادہ قدامت پسند اور خوشامد پرست ہیں، دو چار مصاحب ایک آدھ گاؤں کا کارندہ، دس بیس آسامیاں روزانہ آ ہی جاتی ہیں، باہر آکر بیٹھتے ہی باتیں شروع کر دیتے ہیں، باتیں بلند آواز سے کرتے ہیں، ایسی بلند آواز سے کہ دوسرے سننے پر مجبور ہوں، مسلم لیگ، کانگرس، جنگ، بین الاقوامی سیاست، ہٹلر، مسولینی، چین، جاپان، روس، غرض یہ کہ سیاست کا کوئی ایسا میدان نہیں ہے، جس میں اُن کا گھوڑا سرپٹ نہ دوڑتا ہو، سننے والوں کی تعداد سے اُن کے جوشِ کلام میں کوئی فرق نہیں آتا، ایک نہایت کم حیثیت اور بد قوارہ شخص بھی اگر سننے کے لئے موجود ہے تو دارونہ جی اپنا بورا کھول دیں گے، اور گھنٹوں تقریر کرتے رہیں گے، یورپ کا نقشہ تیس پینتیس برس پہلے دیکھا ہوگا، سیاست پر کبھی کوئی کتاب نہیں پڑھی، اقتصادی تعلقات کا کوئی اندازہ نہیں، قومی خصوصیات اور ملکی ضروریات اور میلانات سے کوئی واقفیت نہیں، لیکن اس کے باوجود بین الاقوامی گتھیاں اُن سے بہتر کون سلجھا سکتا ہے؟

داروغہ جی انگریزی جانتے ہیں، غدر سے پہلے اُنھوں نے شاید بی۔اے کا امتحان پاس کیا تھا، وہ دن ہے اور آج کا دن کہ اُنھوں نے پھر کبھی کوئی اور انگریزی کی کتاب اپنے پاس تک نہ آنے دی: انگریزی کا کوئی جملہ یا کوئی لفظ بھول کر بھی اُن کی زبان فیض ترجمان سے نہیں نکلتا، کسی عنوان سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اُنھوں نے کبھی انگریزی پڑھی بھی ہوگی، بی۔اے پاس کرتے ہی وہ انگریزی تعلیم کے کٹر دشمن ہوگئے، آج تک وہ اس کے روادار نہیں ہیں کہ اُن کی کوئی اولاد انگریزی پڑھے، جو پڑھتا ہے وہ مردودِ ازلی ہے، اور چونکہ مردود ازلی ہے اس لئے اس کو کوئی اخلاقی یا مالی امداد نہیں دی جا سکتی، داروغہ جی پرلے سرے کے بزدل، اور ڈرپوک واقع ہوتے ہیں، اس کی سب سے اچھی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنے سے کمتر درجہ کے لوگوں سے ملنا پسند کرتے ہیں، برابر والوں سے جھجکتے ہیں اور اپنی سی اونچی حیثیت والوں سے لرزہ براندام ہوتے ہیں، برسیں گزر جاتی ہیں۔ اُن کا کسی برابر والے سے سابقہ نہیں پڑتا اور جب سابقہ پڑ جاتا ہے تو اُن کی واماندگی، خجالت اور پسپائی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے، کسی عزیز نے بے نیازی اختیار کی اور وہ

چراغ پا ہوئے، کسی محلہ والے نے برابر کی ٹکر لی، اور اُن کے دفتر سے اُن کا نام کٹا، داروغہ جی کو کسی شخص نے آج تک نہاتے اور کپڑے بدلتے نہ دیکھا نہ سُنا؛ لوگوں کو اس میں شبہ ہے کہ وہ روزانہ صبح کو مُنھ بھی دھوتے ہیں یا نہیں، بال کٹوانے اور خط بنوانے کے بھی سخت چور سُنے گئے ہیں، اس کے باوجود الہیات میں پورا دخل رکھتے ہیں، گیان کی کئی منزلیں طے کر چکے ہیں، پورے بھگت مانے جاتے ہیں، خود شاستری ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، حالانکہ گذشتہ پچیس تیس سال سے ہندی کے ارزاں ترین اخبارات کے علاوہ انھوں نے کبھی کچھ نہیں پڑھا......... وہ دیکھئے اخبار روزانہ "تیج" آپہنچا، داروغہ جی نے اپنی عینک سنبھالی، اور اخبار پڑھنا شروع کر دیا۔

داروغہ جی کے فلسفۂ حیات سے اگر آپ دوچار نہ ہوں، اور اُن کے زمیندارانہ اور افسرانہ رویہ کو انگیز کر سکیں تو پھر آپ کی چاندی ہی چاندی ہے،

پھر آپ کے لئے وہ ایک مجسمۂ صدق وصفا، اور پیکرِ اخلاص ومحبّت ثابت ہوں گے!

بقا صاحب

آپ نے کبھی کبھار ایک آدھ شخص ایسا بھی دیکھا ہوگا جو صورت شکل اور چال ڈھال کے اعتبار سے ہمہ تن ایک ٹڈا معلوم ہو، بہت مختصر سوکھا ہوا مرتعش انسان، بہ ظاہر انسان، قول و فعل کے لحاظ سے سراسر انسان، لیکن شباہت اور حرکات سے ایک ٹڈا، بعض فلسفیوں کا خیال ہے کہ ہر انسان کے چہرے میں کسی نہ کسی جانور کی شباہت موجود ہوتی ہے، بعض وقت ہم، بندر نما، اور گھوڑے نما انسان آسانی کے ساتھ تمیز کرسکتے ہیں۔ اس نواح میں ایک ایسے بزرگ ہیں جن کے چہرے کو دیکھتے ہی ہمیں ایک نیولے کی صورت یاد آجاتی ہے

اسی اندازہ پر غور کرنے سے ہم نے بقا صاحب کو دیکھا اور ہمیں ایک ٹکڑا یاد آیا ع

"وہی نقشہ ہے وہی رنگ ہے ساماں ہے وہی"

بقا صاحب کے نظامِ عصبی میں ہر وقت ایک بھونچال برپا رہتا ہے، اس پر سخت ہکلے، اور ضعفِ بصارت کے پرانے مریض جسمِ اطہر کی بوٹی بوٹی کا پھڑکنا، بات چیت میں ہکلاتے ہکلاتے سانس کا پھولنا، اور کمزور آنکھوں کی مدد سے اپنے دوست کے بازوؤں کو ٹٹول ٹٹول کر پکڑنا، یہ مناظرِ فطرت، بذاتِ خود بے اندازہ دل کش ہیں، لیکن ان کی دل کشی دو چند زیادہ اس وجہ سے ہو جاتی ہے کہ ان کا یہ ایمان ہے کہ ان سا خوش رو نوجوان، اِن سا جری اور دلاور، رستمِ زماں، ان سا عدیم النظیر سائنس داں اور ان سے بڑھ چڑھ کر بین الاقوامی ماہرِ سیاست سرزمین ہند میں کوئی اور پیدا نہ ہوا، جسمانی نقائص کے حامل، فاتر العقل، ہندوستان میں اِس کثرت سے موجود ہیں کہ شاید دنیا میں اور کہیں نہ ہوں، لیکن ان خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود جو شخص ایک عظیم الشان دائمی مغالطہ میں مبتلا ہو وہ یقیناً اس قابل ہے کہ اس کے ہاتھ چومے جائیں، اور ہر سال اُس کا

عرس کیا جائے؛

بقا صاحب نے ایک نہایت گمنام کالج سے مدتیں ہوئیں ام۔ ایس۔ سی پاس کیا تھا، اور چونکہ یونیورسٹی کو سائنس کی تعلیم کو فروغ دینا مقصود تھا اس کے ہر کچّے سے کچّے طالب علم کو تھوڑی سی تھوڑی مدت میں سند عطا کر دی گئی تھی، اس کے بعد بقا صاحب پرمٹ کے محکمہ میں ملازم ہو گئے اور اب تک اسی محکمہ میں رونق افروز ہیں، پرمٹ کے محکمہ کا تعلق براہِ راست مرکزی حکومت سے ہے، اس لئے بقا صاحب کے خیال میں اُن کا اور وائسرائے کا چولی دامن کا ساتھ ہے، یہ یاد رہے کہ ہمارے دوست اِس محکمہ میں کوئی عہدہ دار نہیں ہیں محض ڈاک منشی ہیں، یعنی روزانہ کی ڈاک وصول کرتے ہیں اور روانہ کرتے ہیں، یہ امر اُن کے لئے باعثِ صد ہزار عزت ہے کیونکہ روزانہ اُن کے ہاتھ میں پچاس ساٹھ لفافے آتے ہیں اور اُن کے خیال میں انسان کی برتری اور فضیلت اس کے روزانہ کے ڈاک کے حجم سے وابستہ ہوتی ہے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ بقا صاحب کا آبائی مکان محلہ کے
ایسے حصہ میں واقع ہے جہاں دس پانچ مالدار اور کھاتے پیتے
لوگوں کے مکانات ہیں، اُن کے مکان کی پشت پر اُن کے "نقل
پروانہ" کا عالی شان محل آسمان سے سرگوشیاں کر رہا ہے،
جس میں اُن کی سسرال کی دو خوش نصیب ہستیاں نہایت
عیش و عشرت کی زندگی گذارتی ہیں، دوسری طرف ایک نہایت
دولت مند تاجر چرم کا محل ہے، کچھ اور آگے بڑھ کر چند مالدار
زمیندار اور وکیل آباد ہیں، کچھ فاصلہ پر ایک سیر چشم اور
فیاض طوائف کی کوٹھی ہے جو اب حج کر آئی ہیں اور صوم و
صلوٰۃ کی پابند ہو چلی ہیں، ہم اس کا فیصلہ نہیں کر سکتے کہ بقا
صاحب کے مکان کا جائے وقوع اُن کے لئے مفید ہے یا مضر،
اُن کو اپنے خاندان کے رکھ رکھاؤ پر اپنی حیثیت سے زیادہ
روپیہ صرف کرنا پڑتا ہے، بعض وقت وہ مالی پریشانیوں
میں بھی مبتلا ہو جاتے ہیں، لیکن ان ضروریات کو پورا کرنے
کے لئے اُنھوں نے خالی وقت میں کمانا شروع کر دیا ہے، نتیجہ
اس کا یہ ہے کہ وہ ہر وقت "بکار سرکار قیصر ہند" رہتے ہیں
ہر وقت روپیہ کمانے کی دھن اُن پر سوار رہتی ہے، وہ یقیناً

خوش نصیب ہیں، وہ کمانا چاہتے ہیں اور کما لیتے ہیں۔ بہت سے ایسے بھی ہیں جو کمانا چاہتے ہیں، لاکھ لاکھ جتن کرتے ہیں مگر نہیں کما سکتے۔

دنیا کی تاریخ میں صرف دو ہی ایسی ہستیاں ہوئی ہیں جن کی خوش نصیبی پر ایک عالم رشک کرتا ہے، ایک راکفلر اور دوسرے بقا صاحب مدظلہ العالی،

باریک بیں حضرات جو ظاہری خوش وضع اور خوش قطع ملبوسات کے اندر گھس کر انسان کی روح اور جوہر کا اندازہ کر لیتے ہیں، اسی خیال کو ذہن میں لئے ہوئے ہیں کہ بقا صاحب قسمت کے چہیتے فرزند ہیں۔

پرمٹ میں مستقل ملازم، اور اپنے خیال میں پرمٹ کے محکمہ کے کم از کم روح رواں، آبائی مکان جو ان تک پہنچا وہ بذات خود بغیر کسی خاص اضافہ اور ترمیم کے ایک نہایت عالی شان محلسرائے معہ دیوانہ خانہ، اولاد کے جھگڑے سے بے نیاز، مزید براں فرصت کے اوقات میں ستر اسی روپیہ کا ماہانہ سہارا، اور ان کی اہلیہ محترمہ کا پوا اگاؤں،

آپ خود خیال فرمایئے کہ بقا صاحب سے زیادہ صاحبِ نصیب اس دُنیا میں اور کون ہو سکتا ہے، ؟ غریب راکفلر کو بھی سینکڑوں فکریں اور پریشانیاں رہتی ہوں گی، مگر ہمارے دوست پریشانیوں سے اتنے ہی دور ہیں جس قدر کہ عقل و ہوش اُن سے!

بقا صاحب مذہب کی پابندیوں میں اس طرح گرفتار ہیں جس طرح ایک طوطا پنجرے میں، مذہب سے وہ سراسر نا آشنا ہیں، اسلام کے فلسفہ سے وہ بے خبر ہیں، فقہ اور حدیث کی تعلیمات سے وہ نابلد ہیں، قرآن پاک کو کبھی اُنھوں نے ہاتھ نہیں لگایا، مگر ایک مولوی صاحب کے وہ کچھ اس طریقہ سے مُرید ہیں جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اُنھوں نے اپنی اور اپنے گھر والوں کی نجاتِ اُخروی کا ان مولوی صاحب کو ٹھیکہ دے دیا ہے. بقا صاحب اس ٹھیکہ کا روپیہ بالاقساط ماہ بماہ ادا کرتے ہیں، قیامت کے روز ان کا اور مولوی صاحب کا حساب کتاب ہو جائے گا۔

یہاں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ بقا صاحب کے دفتر

میں دس پانچ اینگلو انڈین بھی ملازم ہیں، اغلباً ان کا ہیڈ کلرک یا نائب ہیڈ کلرک بھی اسی اقلیت سے تعلق رکھتا ہے، بدیں وجہ ہمارے دوست پر اینگلو انڈین ذہنیت بہت زیادہ مسلط ہے، مثلاً

بڑے دن پر اپنے گھر کے لئے خود ڈالی کا انتظام کرنا، مہینہ میں دو بار پک نک کے لئے معہ اہل خانہ شہر سے باہر دیہاتوں میں گھومنا، مہمانوں کی تواضع بجائے پان سے کرنے کے CRAVENA سے کرنا، نوکروں پر انگریزی میں غصہ کرنا، بچوں کے نام انگریزی رکھنا وغیرہ وغیرہ؛

عیسائی حضرات چونکہ اپنی نجات کا ٹھیکہ پادریوں کو دے سکتے ہیں، اسی بنا پر بقا صاحب نے اپنا اور اپنے گھر والوں کا ٹھیکہ شہر کے سب سے مقتدر مولوی کو دے دیا ہے، اس کی بنا پر اب خود اُن کو مذہب سے کوئی سروکار باقی نہ رہا؛ نیاز، نذر، درود، فاتحہ، گنڈے تعویذ، اگر اُن کی بیوی کراتی ہیں تو وہ اینگلو انڈین نقطۂ نظر سے ان کا نوٹس نہیں لیتے۔

بقا صاحب ذات کے پٹھان ہیں، اور بقول اُن کے صحیح النسب

پٹھان، کہتے ہیں کہ ہمارے مورث التمش کے زمانہ میں ہندوستان آئے تھے، چنانچہ اب تک ان کی "سرزمینی ہمدردیاں" غزنی اور بخارا سے وابستہ ہیں، اب تک ہندوستان میں اُن کا دل نہیں لگتا، "بہت گندہ کفرستان ہے"، لیکن تعجب خیز بات ہے کہ اُن کے کسی انداز میں پٹھانیت نہیں پائی جاتی، جسمانی وجاہت تو آپ نے ملاحظہ فرمالی ہے، مزاج کے بھی تھا صاحب بالعموم بہت نرم، دیکھے ہیں، تقریباً آٹھویں دسویں روز، اور وہ بھی زنانے میں اُن پر جلال سوار ہوتا ہے، اس وقت وہ جوالا مُکھی بن جاتے ہیں، آپے سے باہر ہو جاتے ہیں، بہت کچھ کہنا بہت کچھ شور و غل مچانا چاہتے ہیں لیکن اپنے ہکلے پن کی وجہ سے بہت کم کہہ سکتے ہیں، اس پر اُن کے غصّہ کی آگ بہت زیادہ بھڑک جاتی ہے، وہ سب کچھ برداشت کر سکتے ہیں لیکن شکست پندار کی ٹھیس برداشت نہیں کر سکتے، ان کے مغالطہ پر آنچ آئی اور وہ آگ بگولا ہوئے، اُن کے غلط فہمی کے نقاب سے آپ نے ذرا مس کی اور وہ جبار قہار بنے، ورنہ بالعموم وہ بہت شیریں گفتار اور خلیق انسان ہیں؛

اس میں آپ کا بھی کیا ہرج ہے کہ آپ انھیں محلہ کی سب سے

عظیم المرتبت ہستی مان لیں ؟ اس میں آپ کا کیا نقصان ہے کہ آپ انہیں پرمٹ کے محکمہ کا روحِ رواں اور مرکزی حکومتِ ہند کا ایک رکن تسلیم کریں ؟ سائنٹفک معلومات اگر اُن کے خیال میں اُن کی سب سے بڑھی چڑھی ہیں تو آپ کیوں برہم ہوں ؟ ہٹلر اور چرچل اگر اپنی تدابیر میں اُن سے مشورہ کر لیا کرتے ہوں تو آپ آپے سے باہر کیوں ہوں ؟ حکومت ہند کی تمام خفیہ اور علانیہ کارروائیاں اگر بقا صاحب کے ایما سے ہو رہی ہوں تو آپ کے دماغی توازن میں ہل چل کیوں پیدا ہونے لگے ؟ ہر کسے را بہر کارے ساختند، بقا صاحب کیلئے بھی فطرت نے کوئی کام منتخب کیا تھا، وہ اپنا کام کر رہے ہیں، فطرت اپنا کام کر رہی ہے، چاند سورج اپنا کام کر رہے ہیں ....

آپ غصہ میں آپے سے باہر ہوئے جاتے ہیں، کیا آپ کا یہی کام ہے ؟

بقا صاحب کی دو حالتیں ہمیشہ یادگار رہیں گی، ایک تو جب وہ غسل خانے سے نہا دھو کر باہر آتے ہیں، جب تک نہاتے رہتے ہیں برابر گاتے یا گنگناتے رہتے ہیں، باہر آئے اور بازو دَں کی توانائی اور سختی خود بھی غور سے دیکھتے ہیں، اور اپنے دوستوں

کو بھی دکھاتے ہیں، سینہ کے پھیلاؤ میں ہر ہفتہ اضافہ ہوتا ہے، کلائیوں میں جو توانائی واقع ہوتی ہے، پنڈلیوں میں جو آماس ہر روز بڑھتا ہے (اور اُن کے خیال میں یہ اضافے روزانہ ہوتے رہتے ہیں) اُن کو دیکھ دیکھ کر وہ انگریزی بولنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اُن کے سارے دوست اُن کی جسمانی شان و شوکت کی داد روزانہ دیتے رہیں، دوسری قابل دید حالت سہ پہر کو ہوتی ہے جب دفتر سے واپس آکر چار نوش فرماتے اور اینگلو انڈین ناشتہ کرتے ہیں، اس کے بعد وہ اپنی پتلون کی جیبوں میں دونوں ہاتھ ڈال کر مکان کے تنگ و تاریک صحن میں ٹہلتے ہیں، اور سیٹی بجاتے رہتے ہیں، اس وقت اُن کے دہن مبارک سے تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد دو چار انگریزی الفاظ بھی بے اختیارانہ طور سے نکلتے رہتے ہیں، دیکھنے والوں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کرنل گڈنی آنجہانی اپنی درماندہ قوم کے تاریک مستقبل کے متعلق سرگرم تفکر ہے،

کسی محلہ والے کی دعوت کی "چوٹ" پر اس سے بڑھیا دعوت کرنا، خاندان کی ہر تقریب سے بڑھ چڑھ کر اپنے ہاں

کی غیر ضروری تقریبات پر ہزاروں روپیہ برباد کرنا، ہر روز شام کو ریڈیو پر سارے محلہ کو مدعو کرنا، گرمیوں میں میم صاحب کے ساتھ پہاڑ پر جانا، بڑے دن کی تعطیل وائسرائے کے ساتھ کلکتہ میں بسر کرنا، شہر کے عمائدین کے سامنے نیازمندی اور نیچے بے تکلفی برتنا، چنگی کو اپنے ہاں کی لونڈی ڈسٹرکٹ بورڈ کو اپنے ہاں کا خانہ زاد تصور کرنا، ہر محکمہ میں ناقابلِ حصول اثر و اقتدار کا دعویٰ کرنا، کوتوال شہر کو اپنا لنگوٹیا یار بتانا، ہر ہفتہ کہیں نہ کہیں دو تین تار دے دینا اور اُن کی رسیدیں سب مردانے کی میز پر جمع رکھنا، موٹر کی خریداری کے بارے میں ہر ہفتہ دو چار شخصوں سے بات چیت کرتے رہنا، دو ایک جگہ موٹر بھی دیکھنے جانا، ہر سیاسی اور شہری معاملہ پر حاکمانہ رائے دینا اور اپنے خیال میں اپنے آپ کو دنیا کی ایک یادگار ہستی تصور کرنا۔ بقا صاحب کی یہ خصوصیات کس درجہ دل کش ہیں۔

ہم کل شام ہی اپنے دوست کے ہاں سے ریڈیو سن کر رات گئے واپس ہوئے تھے، ہم اکثر و بیشتر اُن کے ہاں جاتے رہتے ہیں، ہمارے دوست ہم سے شکایت کرتے ہیں کہ

آپ سینما بالکل نہیں جاتے، آپ خود فرمایئے کہ اِس "زندہ تصویر" سے بھی کوئی بے جان تصویر زیادہ دلچسپ ہوسکتی ہے؟

قومی رضاکار

"قومی رضاکار"!

توبہ ہی بھلی!!

کس قدر اعلیٰ درجہ کا بور، کس قدر مضحکہ خیز انسان، اور کس درجہ حواس برہم کن چیستاں ہوتا ہے!!! سفید گاڑھے کی شیروانی، گاڑھے کی گاندھی کیپ، گاڑھے کا چوڑی دار پاجامہ پاؤں میں فل سلیپر ہوا تو موزے ندارد، بوٹ ہوا تو تسمہ غائب۔ چہرۂ مبارک پر اس بلا کی خشکی اور تلخی کہ خدا کی پناہ، وہی ایک لَے، یکساں آواز، یعنی اپنے ادارے کی تعریف و توصیف، اپنے قومی مقاصد کا پرچار، قوم کی خستہ حالی کی دلدوز داستان......

ملک کی ابتری کا جگر خراش افسانہ،

اور

ہر گفتگو میں اُن ہی الفاظ کا در و بست، یکساں تراکیب، یکساں زیر و بم، حقیقت تو یہ ہے کہ ہندوستان میں خوش حالی اور فارغ البالی اُس روز آئے گی جس دن قومی رضا کاروں کا خاتمہ ہوگا، ہم نے سیکڑوں اونچے نیچے، ٹھنڈے گرم قومی رضا کار دیکھے ہیں، اس معمہ پر خوب غور کیا ہے، اسے پرکھا ہے، جانچا ہے، مگر قومی رضا کار کا ہم سے زیادہ جانی دشمن آپ کو اب دنیا بھر میں کہیں نہ ملے گا، لیکن ایمان کی بات تو یہ ہے کہ اس جذبہ اور عقیدہ کے باوجود ہم مرزا صاحب کے قائل ہیں، دل و جان سے اُن کے مداح اور ثنا خواں ہیں، اور جہاں تک بن پڑتا ہے ہم اُن کی دامے، درمے، سخنے مدد کرتے رہتے ہیں اور کبھی کبھار اُن کی تگ و تاز میں بھی شریک ہو جاتے ہیں؛

مرزا صاحب کا ہم پر جادو کیسے چلا؟ ہم اُن کے دام میں کیسے گرفتار ہوئے؟

اس کا جواب مرزا صاحب کی دلکش شخصیت، اُن کا صاف و

ستھرا لباس، اُن کا تبحر علمی، اور اُن کی خُداداد ذہانت دے سکتی ہے، خودداری و فروتنی، ذہانت و خاموشی صداقت و انکساری ان کا دل کش ترین مجموعہ اگر آپ کو دیکھنا ہو تو آپ مرزا صاحب سے ضرور ملیں آپ کا دل باغ باغ ہو جائے گا، مرزا ہر موضوع پر نہایت عالمانہ اور شُستہ گفتگو کر سکتے ہیں، گفتگو بھی کہ گویا پھول جھڑ رہے ہیں۔ موتی برس رہے ہیں۔ اگر ہندوستان میں مرزا صاحب جیسے رضاکار پیدا ہو جائیں تو پھر آفتاب آزادی بہت جلد آسمانِ ہند پر طلوع ہو جائے۔

مرزا صاحب لندن یونیورسٹی کے ام، اے ہیں، علیگڈھ کے "کھلنڈرے" رہ چکے ہیں، سات سمندر ہو آئے ہیں، اعلیٰ درجہ کے مقرر اور انشاپرداز ہیں، دُنیا کی سیاست پر ماہرانہ رائے رکھتے ہیں۔ آرٹ کے ایک بلند پایہ نقاد ہیں۔ لیکن مرزا صاحب کو اور اُن کے مشاغل کو دیکھ کر یہ پتہ نہیں چلتا کہ مرزا صاحب ان خوبیوں کے حامل ہو سکتے ہیں، ظاہری سج دھج سے ایک خوش مزاج، خوش مذاق اور خوش پوش کارندے معلوم ہوتے ہیں، چہرہ کتابی، رنگ گندمی۔ اس پر فرینچ کٹ داڑھی، آدھی سفید اور آدھی کالی، بدن پر صاف ستھری بہت اچھی

ڈھلی اور سلی ہوئی شیروانی، جسم کی فربہی اور قد کی لمبائی کی وجہ سے یہ لباس مرزا صاحب پر خوب سجتا ہے، بہت بھلا معلوم ہوتا ہے، عرصہ ہوا مرزا صاحب "دفتری اوقات" میں اکثر سُوٹ بوٹ بھی زیب تن فرما لیتے تھے لیکن جبر و اکراہ کے ساتھ، اب مدت سے دفتر کے اوقات میں بھی شیروانی پہننا شروع کر دی ہے، قومی کاموں میں اُن کا انہماک جس قدر بڑھتا جاتا ہے، اُسی قدر وہ انگریزی لباس سے دُور ہوتے جاتے ہیں، مرزا صاحب میں یہ ایک اور خوبی ہے کہ شیروانی پہن کر اس قدر عمدہ انگریزی بولتے ہیں کہ سننے والے حیرت میں پڑ جاتے ہیں، لب و لہجہ خاص ٹکسالی زبان ڈھلی، دُھلائی، صاف، ستھری، جیسے کسی زمانہ میں قلعہ معلیٰ کی اُردو ہوتی تھی!

مرزا صاحب اُن رضاکاروں میں نہیں ہیں جو اُٹھتے بیٹھتے خود ساختہ "اصول" زندگی بیان کرتے رہتے ہیں جن اصولوں پر خود کو عمل پیرا ہونے کی کبھی توفیق نہیں ہوتی، ان رضاکاروں کی ہر تیسری سنجیدہ بات ان کا ایک "اصول" ہوتی ہے، جس کو وہ اس قدر بلند آہنگی سے بیان کرتے ہیں کہ سُننے والے چراغ پا

ہو جاتے ہیں اور غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بلند آہنگی بیکار تھی اور اُن کا بیان کردہ "اصول" لغو اور بے معنی! ....

ہاں! تو مرزا صاحب سیرِ فرنگ سے واپس آکر نہایت خاموشی اور استقامت کے ساتھ ایک نہایت ضروری اور بیحد مفید قومی خدمت میں ایسے منہمک ہو گئے کہ پھر اُن کو دنیا و مافیہا کی خبر نہ رہی وہ دن ہے اور آج کا دن کہ مرزا صاحب نے اپنے اوپر ٹھنڈا پانی حرام کرلیا، اب اُن کے دن کا بیشتر حصّہ اسی روح فرسا اور صبر آزما شغل میں بسر ہوتا ہے، اپنے مقاصد اور اپنے ادارے کی کارروائی کا پروپگنڈہ بہت کچھ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے بڑی سے بڑی قربانی لیکن خود اپنا پروپیگنڈا، خود اپنا نام و نمود بالکل غائب! مرزا صاحب اس کے لئے بالکل تیار نہیں ہوتے کہ اُن کا نام کسی اخبار یا کسی اشتہار میں شائع ہو!

مگر ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ ایک ہلاکت آفریں کمزوری بھی ہے وہ کسی جماعت کے ساتھ کام کرنے سے خوش نہیں ہوتے، عمل دخل سراسر اُن ہی کا ہو، کسی کو یارائے دم زدن نہ ہو، مخالفت کی کوئی آواز نہ نکالے، جب تک یہ ہوتا رہے گا مرزا صاحب بڑی خوش اسلوبی اور محنت کے ساتھ کام کرتے رہیں گے، کسی نے

مخالفت کی آواز بلند کی، اور مرزا صاحب نے اپنے گھر کی راہ لی؛ استعفےٰ دے مارا، اور استعفےٰ بھی ایسا کہ اس پر نظرِ ثانی ناممکن، شہر والے ان کی خوبو سے واقف ہوگئے ہیں۔ اُن کے کاموں میں اب کوئی مخل نہیں ہوتا، کوئی مین میخ نہیں نکالتا؛

"قومی رضاکار" (اللہ اُسے جلد جنت نصیب کرے) اغلباً اس وجہ سے بور ہوتا ہے کہ اس کے خشک دماغ میں مزاح اور تفریح کی صلاحیت باقی نہیں رہتی، مبصّرین کا خیال یہ ہے کہ قومی رضاکار اپنے "فن کرخت" میں جس قدر پختہ اور مکمل ہوتا جائیگا اسی حد تک اس کے دماغ سے مزاح اور تفریح کی صلاحیت مفقود ہوتی جائیگی، مگر مرزا صاحب اس معاملہ میں یا تو مستثنیات سے ہیں یا ابھی تک اس فن مُبارک میں "نوسکھ" ہیں گو اُن کے سج دھج اور انداز سرگرمی سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ اس تالاب کے ایک کہنہ مشق تیراک ہیں، مگر یہ بات نہایت تعجب خیز ہے کہ اُن کے دماغ اور خشکی سے اب تک کوئی موانست پیدا نہیں ہوئی؛ مرزا صاحب شعر بھی کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں، مشاعروں میں شریک ہوتے ہیں اور بڑے ٹھاٹ اور ترنم کے ساتھ اپنا کلام

سُناتے اور جھومتے جاتے ہیں، غزل سے بہتر نظم کہتے ہیں، لیکن سیاسی نظم کو شاعری کی توہین سمجھتے ہیں، گپ کرتے ہیں، گو شاذونادر، لیکن اُن کی گپ میں ایک عجیب مٹھاس اور شگفتگی ہوتی ہے، پان کھاتے ہیں نہایت بانکے دَل دار اور دلنواز پان،

اِن امور کے باوجود

رضاکاری اور قومیت مرزا صاحب پر بڑی طرح مُسلط ہیں ایک نہایت اہم قومی ادارہ اُن کی نگرانی میں ہے جس کو سرسبز اور شاداب کرنے کے لئے بے اندازہ روپیہ کی ضرورت ہے اور جس کے مقاصد کی تبلیغ اور ترویج ابھی چار پانچ سال مُسلسل اور ہونا چاہیئے۔ مرزا صاحب کی روح، اُن کا ایمان، اُن کا وقت اُن کی قوت، اُن کے تمام اثرات اسی مہتم بالشان کام کے لئے وقف ہیں، دن بھر اور بعض اوقات رات کے دس دس بجے تک اِس چکر میں غلطاں و پیچاں بقول شخصے "خدائی خوار" پھرتے رہتے ہیں، کہیں جھڑکیاں کھاتے ہیں، کہیں مذاق اُڑایا جاتا ہے، کہیں مخالفت ہوتی ہے، کہیں الزامات لگائے جاتے ہیں، کہیں فقرے اور پھبتیاں کسی جاتی ہیں، لیکن مرزا صاحب کے

چہرے پر شکن نہیں پڑتی، دن رات یہی دُھن ہے، یہی اوڑھنا ہے،
یہی بچھونا ہے اور یہی کھانا ہے، یہی پینا ہے۔

ہمیں مرزا صاحب سے دلی ہمدردی ہے، ہم سے اُن
کی کبھی کبھار راز و نیاز کی باتیں بھی ہو جاتی ہیں، ایک روز کہنے لگے
کہ آج دو ایک جگہ ہمارے ساتھ چلے چلو، دنیا کا کچھ تجربہ
ہو جائے گا۔

(۱)

ایک نہایت بلند اور وسیع ڈرائنگ روم میں پہونچے،
صاحب خانہ ایک نہایت پُر تکلف صوفے پر جلوہ افروز تھے،
دو تین سن رسیدہ اور پانچ چھ ادھیڑ عمر کے حاجتمند اصحاب
وہاں اِدھر اُدھر دُبکے دُبکائے بیٹھے تھے، صاحب خانہ ایک
ضروری خط ملاحظہ فرما رہے تھے، کمرے میں سکوتِ مطلق تھا،
صاحبِ خانہ کے چہرہ سے بلا کی شرارت آمیز عیاری اور دُنیا
داری ہویدا تھی۔

صاحب خانہ (مرزا صاحب کے مودبانہ اور دو دستہ تسلیم
کے جواب میں) اخاہ! آیئے، مرزا صاحب!

مرزا صاحب۔ حاضر ہوا خداوند!

صاحب خانہ۔ چھٹن! پان لاؤ، سگریٹ لاؤ، (پھر خط پڑھنا شروع کر دیتے ہیں)

حاضرین نے ایک دوسرے کا نظری جائزہ لینا شروع کیا میں نے دل ہی دل میں کمرہ کی خوبصورتی اور آرائش کی داد دی، کس قدر بیش قیمت سامان سے سجا ہوا تھا!

دس منٹ کی خاموشی کے بعد صاحب خانہ پھر مرزا صاحب سے متوجہ ہوئے "اور اس مرتبہ سخت" ہندوستانی " انگریزی میں کچھ نہیں اخلاق برتا گیا، مرزا صاحب نے کس قدر پیاری انگریزی اس کے جواب میں بولی، میں سُن کر حیران رہ گیا، صاحب خانہ اس دوران میں ٹیلیفون پر اپنے کسی دوست سے باتیں کرنے لگے تھے، انھوں نے یہ بھی غور نہ کیا کہ مرزا صاحب گویا ہیں یا خاموش،

ٹیلیفون پر بیس پچیس منٹ تک اپنے کسی پنجابی دوست سے اُردو، انگریزی اور پنجابی میں ہنسی، مذاق، دل لگی کی باتیں دعوتوں کے وعدے، سینما جانے کی قرار دادیں، کلب کے ایٹ ہوم پر نکتہ چینی کرتے رہے، صاحب خانہ پھر بھول چکے تھے کہ اُن کے ڈرائنگ روم میں کوئی مہمان ہے بھی یا نہیں ہم نے

مرزا صاحب کو غور سے دیکھا، وہ اب تک صبر و استقلال اور عجز و انکساری کا پُتلا بنے ہوئے تھے۔ اِسی اثنا میں کوئی صاحب موٹر میں وارد ہوئے اور "اکڑا فوں" کرتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آدھمکے، صاحب خانہ فی الفور اُن کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کر کسی سے بغیر کچھ کہے سُنے چل دیئے؛

اب ہم دونوں سائیکلوں پر جا رہے تھے،

مرزا صاحب: ارے بھئی، سُنا تم نے؟

مَیں: فرمائیے،

مرزا صاحب: آج ذرا ڈپٹی صاحب کے ہاں جانا ہے۔

مَیں: کیوں؟

مرزا صاحب: میاں! تین چار ماہ سے روز حاضر ہوتا ہوں بڑے ہمدرد معلوم ہوتے ہیں، شاید کچھ مدد کر جائیں۔

میں: کر چکے!

مرزا صاحب: بھئی بہت جلد نا اُمید ہوتے ہو........ آج تو مجھے بڑے شدومد کے ساتھ بُلایا ہے۔ کل بڑا اصرار کر رہے تھے!

میں۔ چلئے، میں حاضر ہوں........گر یہ خیال رہے کہ دھوپ بہت تیز ہو چلی ہے!

ہم لوگ آدھے گھنٹہ کی مشقت کے بعد ڈپٹی صاحب کی کوٹھی کے احاطہ میں داخل ہوئے، احاطہ میں پھولوں کی کثرت اور درختوں کی خوبصورتی عجب پُر لطف تھی، لیکن دھوپ کی شدت اور سائیکل چلانے کی مشقت سے ہم دونوں کا بُرا حال تھا، ابھی ہم سائیکلوں پر سے اُترے ہی تھے، کہ ایک نہایت پُر تکلف کار تیزی سے نکلی، کا مدانی کا نہایت باریک اور برف کی طرح سفید کُرتا ڈپٹی صاحب پہنے ہوئے تھے، سر پر ہیٹ ذرا ترچھا رکھا ہوا تھا، ہمیں دیکھ کر وہ مُسکرائے، اتنی دیر میں موٹر کہاں سے کہاں پہونچ چکی تھی۔

(۲)

مرزا صاحب! واپسی تو اب برحق ہے، لاؤ راستے میں نواب صاحب سے ملیں،

میں۔ (تجاہل عارفانہ کے ساتھ) کون نواب صاحب؟

مرزا صاحب! نواب لڈن صاحب،

میں! وہ تو اب قیلولہ میں ہوں گے،

مرزا صاحب: چلئے شاید مل جائیں، ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے۔

پون گھنٹہ کی دھوپ کی سختی اور سائیکل چلانے کی محنت کے بعد خدا خدا کرکے "جعفر منزل" پہونچے، پھاٹک پر سنگین کا پہرہ تھا، اطلاع ہوئی، پندرہ منٹ بعد حکم ہوا کہ تشریف لائیں، میرے ماتھے سے پسینہ ٹپ ٹپ گر رہا تھا مگر مرزا صاحب حسبِ معمول نہایت شگفتہ تھے، کمرے میں داخل ہوتے، کمرے کے ہر دروازہ پر موٹی موٹی خس کی ٹٹیاں لگی ہوئی تھیں، پنکھے چل رہے تھے، کمرے میں بجلی کی دھیمی روشنی ہو رہی تھی، نواب صاحب کے دو چار مصاحب، تین چار خدمت گار موجود تھے، میں نواب کو دیکھ کر بہت گھبرایا، سخت جاہل اور کندۂ ناتراشس معلوم ہوتے تھے، ہمارے داخل ہوتے ہی مصاحبوں نے ایک دوسرے کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا۔

نواب صاحب: (مرزا صاحب کے مودبانہ تین سلاموں کے جواب میں) کہو، بھئی مرزا!

مرزا صاحب: سرکار کا مزاج کیسا ہے؟

نواب صاحب: آج بہت دنوں میں آئے؛

مرزا صاحب: جی نہیں، خداوند! پرسوں تو سلام کو حاضر ہوا تھا؛

نواب صاحب: تمہاری انجمن، بھئی! ہمارے تو کچھ سمجھ میں آتی نہیں کہ کیا بلا ہے؟

مرزا صاحب: سرکار غور فرمائیں گے تو انجمن کے مقاصد واضح ہو جائیں گے،

نواب صاحب: خُدن! خُدن!!......

"لا، پتّے تو لا، ذرا ایک آدھ "باجی" (بازی) ہو جائے"

خُدّن۔ سرکار، پتّے حاضر ہیں"

تین منٹ کے بعد نواب صاحب اور اُن کے مصاحب بڑے انہماک سے "تاش" کھیل رہے تھے، اور میں تصویر حیرت بنا ہوا مرزا صاحب کے چہرے کو دیکھ رہا تھا، اس چہرہ کی شگفتگی اور مُسکراہٹ اب تک بدستور قائم تھی،

مگر

میں دل میں عہد کر چکا تھا کہ اب مرزا صاحب کے ساتھ کبھی کہیں نہ جاؤں گا؛ میں فانی انسان تھا،

لیکن

مرزا صاحب کی خوش دلی اور توقعات میں اِن تین "حادثوں"
سے کوئی فرق نہیں آیا!
کیا اُن کی روحانیت نے اُن کو غیر فانی بنا دیا ہے؟

میجر عبداللہ

علی گڈھ میں پندرہ سال کے قریب قیام رہا۔ گو اب علی گڈھ چھوڑے ہوئے ایک مدت ہو گئی ہے، مگر اب بھی عالم خیال میں اکثر علی گڈھ پہونچ جاتا ہوں، اور وہاں کے خاص خاص احباب اور محبت آفریں واقعات کے مناظر کو یاد کر لیا کرتا ہوں، مگر جب کبھی علی گڈھ جاتا ہوں میرے دیرینہ آقائے نامدار سب سے پہلے میری نظر کے سامنے آجاتے ہیں، اب مدت سے اُن سے ملاقات نہیں ہوئی ہے لیکن یہ ناممکن ہے کہ میجر عبداللہ کو ایک منٹ کے لئے بھی بھول جاؤں۔

———:(※):———

اُس زمانہ میں میجر کی عمر کچھ کم پچاس کی ہو گی، لیکن اپنی چال، ڈھال، اور دم خم سے وہ زیادہ سے زیادہ تیس برس کے معلوم ہوتے تھے اس پر بلا کے تیز گام اور چابک دست، بے حد پھرتیلے، اور صبا رفتار تھے، داڑھی اور مونچھیں بہت پابندی سے منڈواتے تھے، بدن بہت چھریرا، اور اُن کی آنکھیں بڑی تیزی سے اِدھر اُدھر، یمین و یسار حرکت کرتی رہتی تھیں، یہ تو اُن کا جسمانی حُلیہ ہوا، دماغی کیفیت پر روشنی ڈالنے کے لئے ذرا غور و تامل کی ضرورت ہے، یہ معلوم کرنا دشوار ہے کہ اُن کے ذہن کی کون سی قوت سب سے زیادہ نمایاں تھی، مجموعی حیثیت سے بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ نہایت ذہین، طبّاع، اور زود فہم تھے، اغلباً اب بھی اُن کی یہی حالت ہو گی، مجھے اکثر اس کا افسوس ہوتا تھا کہ میجر عبداللہ کو تعلیم حاصل نہ ہو سکی، ورنہ وہ آج ہندوستان پر چھائے ہوتے۔

میجر صرف دن دن کے نوکر تھے، رات کو کھانا کھلا کر یونیورسٹی سے شہر چلے جایا کرتے تھے، میں نے بارہا اس کی

کوشش کی میجر رات کو بھی وہاں قیام فرمائیں، لیکن میجر اِس کے لئے کبھی تیار نہ ہوئے اور بہ لطائف الحیل اس عرضداشت کو ٹال دیتے تھے، رات میں گھر جانے کی اُن کو کچھ جلدی بھی نہ ہوتی تھی، دس گیارہ بارہ بجے تک بھی اُن کو شہر جانا کبھی ناگوار نہ ہوا، سالانہ مشاعرے کے موقعہ پر اگر دو تین بجے بھی فرصت ملی تب بھی چل دیئے اور چھ بجے صبح کے کڑا کے کے جاڑوں میں نہایت پابندی سے حسب معمول واپس بھی آگئے

بارہا عرض کیا کہ بندہ پرور! اِس راستہ ناپنے سے کیا حاصل؟ لیکن میجر نے اس کا جواب ہمیشہ ایک خوش آئند مسکراہٹ سے دیا اور اپنے کام میں زیادہ منہمک ہو گئے۔

ایک پُرانے حکیم کے بارے میں ایک روایت سُنی تھی، مریض نے آ کر حکیم صاحب کو دروازہ پر آواز دی، اندر سے نسخہ لکھا لکھایا آگیا، اور مریض مطمئن ہو کر چل دیا، مدت تک میں اِس لطیفہ کو مبالغہ کا ایک شاہکار ہی سمجھتا رہا، لیکن میجر کی خدمت میں رہنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ یہ لطیفہ ایک واقعہ بھی ہو سکتا ہے! اِسی لئے میں اپنے آقائے نامدار کی ذہانت اور زود فہمی پر ایمان لے آیا، میں نے آواز دی "عبداللہ"! ناممکن تھا کہ کچھ تیصدی

صورتوں میں میجر میرا مافی الضمیر سمجھ جاتے ہوں اِس ذہانت پر اُن کی مستعدی، بھاگ دوڑ، تیزی و طراری، نا ممکن تھا کہ میجر کا آقا اُن کے پاؤں دھو دھو کر نہ پیے۔

مغربی مفکرین کا خیال ہے کہ "قتل عمد" فنونِ لطیفہ میں داخل ہونا چاہیئے، ہمیں اس بحث میں پڑنے کی فی الحال ضرورت نہیں لیکن ہمیں یقین ہے کہ "بحث بازی" اس کڑی میں ضرور منسلک کی جاسکتی ہے، ناظرین کو یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ میجر عبداللہ اس فن کے اس زمانہ میں مسلم الثبوت اُستاد مانے گئے ہیں، کسی سوال کے جواب دینے میں آپ ان کو قاصر نہ پائیں گے، یہ جوابات سراسر بحث بازی ہی پر منحصر نہیں ہوتے، میجر کی اطلاعات اور حالات حاضرہ کا علم اس کی بساط کے اعتبار سے غیر محدود ہے مگر یہ ضرور ہے کہ جس شئے کا علم ناقص ہوتا ہے وہ اس کو بحث بازی کے ذریعہ پورا کر لیتے ہیں، اس پر طرّہ یہ ہے کہ چہرے کی متانت میں کبھی فرق نہیں آتا، نہ آپ یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ یہاں عبداللہ "کھینچ" رہے ہیں۔

میجر یکساں زندگی سے بہت جلد اُکتا جاتے تھے، ہفتہ دو ہفتہ یونیورسٹی میں سکون رہا اور میجر وحشت زدہ ہونے لگے، دو چار روز اگر یہی حالت رہی ناممکن ہے کہ میجر بیمار نہ پڑجائیں، اُن کے معدے کا فعل بگڑ جائے گا، ان کا جگر اپنا کام کرنا چھوڑ دے گا، اُن کے قلب کی رفتار دگرگوں ہو جائے گی اور وہ مجبور ہوں گے کہ دو چار یوم کی بالکل سراسر "اتفاقیہ" رخصت لیں اور ایسے غائب ہو جائیں کہ اس روئے زمین پر اُن کا کہیں پتہ نشان نہ ملے۔ یونیورسٹی میں پھر کچھ ہماہمی شروع ہوئی اور میجر پھر آموجود ہوئے اور اپنے فرائض اور زیادہ انہماک، مستعدی اور جوش و خروش سے ادا کرنے لگے۔ غور کرنے سے پتہ چلا کہ میجر کو میدانِ عمل سب سے زیادہ مرغوب ہے، بے حسی، تعطل اور سکوت کے وہ جانی دشمن ہیں اور اپنی روح کی پوری قوت کے ساتھ اِس فکر میں رہتے ہیں کہ یونیورسٹی میں ٹورنامنٹ، آل انڈیا مشاعرہ، گورنر کی آمد، اور وائسرائے کی تشریف آوری روز ہوتی رہے اور اُن کے آقا کے یہاں روز دو چار مہمان آئیں دو چار جائیں رات کو ڈنر ہو اور سہ پہر کو عصرانہ، ظاہر ہے کہ دُنیا اُن کے جذبات کا احترام کم کرتی ہے۔

جہاں اُن کو نظام عالم کی بے التفاتی کا احساس ہوا اور اُنھوں نے "فرنچ لیو" لی:

کہیں ڈنگل میں جا نکلے، کبھی سرکس میں جا کودے، کہیں نوٹنکی میں جا دھمکے، کبھی بیروں کی ٹیم لے کر دو تین فٹ بال کی میچیں کھیل آئے........ اور اس کے بعد

"پھر وہی کُنج قفس، اور وہی صیاد کا گھر"

میجر کو طلبا کے کھیلوں سے سچا عشق تھا اور اس کے کردار میں ایک "مکمل کھلاڑی" کی چند خوبیاں بدرجۂ اتم موجود تھیں، نہایت وفا شعار تھا، روپیہ پیسہ کے معاملہ میں پکا اور سچا اور اپنی عزت و آبرو کا ایک جوشیلا نگہبان، خوددار تھا، باوضع، بامروت آپ سے محبت کرنے والا، اور آپ کی دل سے عزت کرنے والا اپنے گذشتہ آقاؤں کو ہمیشہ محبت کے ساتھ یاد کرنے والا، اور اُن کا دل سے دُعا گو؛

زندگی کے ابتدائی مراحل میں اگر کچھ مناسب ہدایات اور تربیت مل جاتی تو میجر عبداللہ قوم کے ایک نامور فرزند ہوتے لیڈر بننے کے بہت سے "ناہموار" اوصاف اب بھی اُن میں موجود تھے، باہمت تھے، حوصلہ مند تھے، غیرت مند تھے، ایک

نمایاں حد تک ایثار، اور خُدا جانے کیا کیا کر سکتے تھے، اُن کا ایک واقعہ عرض کئے دیتا ہوں جو دلچسپی سے خالی نہیں ہے :

میرے ایک برادر محترم علی گڈھ میں ایک "گینگ کیس" کرنے چند یوم کے لئے تشریف لائے، اُنھوں نے شہر جانے کے لئے مجھے چار بجے کچہری بلایا تاکہ وہاں سے میں اُن کو اپنے ہمراہ لے سکوں، میجر عبداللہ میرے ہمراہ تھے، عدالت کے کمرہ میں بہت بھیڑ تھی، میں برآمدے میں کھڑا ہو گیا اور میجر کو کارڈ دے کر کمرے میں بھیجا، وہاں دو چار تھانے دار، دس پندرہ سپاہی، نصف درجن وکیل، اور پچاس ساٹھ پابجولاں ملزم موجود تھے، ساری کچہری میں ہماہمی برپا تھی، میجر پہلے تو کچھ ڈرے، کچھ سہمے، لیکن جب اُن کو محسوس ہو گیا کہ عدالت کی کرسی پر بھائی صاحب ہی رونق افروز ہیں تب تو اُن کی بشاشی، طرب انگیزی اور شادمانی کی کوئی انتہا نہ رہی، اور لگے وہ عدالت کے برآمدے میں بضرورت سرپٹ بھاگنے، ابھی یہ گئے، ابھی وہ گئے، ابھی اِدھر نکلے، ابھی اُدھر نکلے؛ گویا دنیا والوں کو اعلان کر رہے تھے کہ زندگی ہماہمی اور ہنگامہ کا نام ہے :

چاہے وہ ہماہمی اور ہنگامہ لوگوں کو جیل خانہ ہی کیوں نہ لیجائے

کالے خاں

بڑے بڑے معاملات اور مہتم بالشان معرکوں میں نہایت نڈر اور بہادر، چھوٹی چھوٹی باتوں میں کمزور اور بزدل، سایہ سے ڈرنے والے، لیکن مست ہاتھی سے ٹکر لینے والے، فیاضی اور اولوالعزمی میں حاتم وقت لیکن ذرا ذراسی بات میں خوردہ گیر اور کفایت شعار، مشکل سے مشکل راہ اختیار کرنے کا عادی، لیکن کمزور لمحات میں زندگی کی معمولی رفتار سے ڈر جانے والے، جس قدر معاملہ زیادہ اہم، زیادہ پرخطر، اسی قدر زیادہ تن دہی سے اس میں جان لڑا دینے والے، خوشامد کرنے سے نفور، لیکن خوشامد سے اثر قبول کرنے کا عادی، اگر یہ کوئی منطقی تعریف

ہوسکتی ہے تو کالے خاں کی یہی تعریف ہے۔

دنیا میں طرح طرح کی مخلوق ہے، بعض لوگ زر و جاہ کے بندے ہیں، کچھ لوگ اللہ رسول کے بندے ہیں، چند شہرت اور ناموری کے بندے ہیں، مدت تک کالے خاں اپنے "موڈ" کے بندے بنے رہے، اب بھی اُن کی فطرت میں موڈ کا بہت کچھ دخل ہے، گو مدت سے وہ اپنے نفس پر قابو پانے کی جدوجہد میں مصروف ہیں، لیکن اب بھی کبھی کبھی نفس کا صبار فتار گھوڑا قابو سے باہر ہو جاتا ہے، فطرت نے کالے خاں میں جس قدر خوبیاں جمع کی تھیں اُن کا حصر دراصل نہایت مشکل ہے لیکن ہمیں افسوس ہے کہ اُن کی بہت سی خوبیاں آج تک پایۂ تکمیل کو نہ پہونچیں ورنہ وہ آج یگانۂ روزگار ہوتے، ذہانت میں برق و بلا، محنت میں کسی سے مُتھرے نہیں، ڈیل ڈول، اور ظاہری سج دھج میں بے عیب، مردانہ حُسن میں لاثانی، وجاہت کے بادشاہ، لیکن یہ دل کش شخصیت ایک متلون، موڈ، کے تابع فرمان ہے، ذرا عقل بھی کافی دُوررس نہیں ہے، غور و فکر کا مادہ کم ہے؛ بالالتزام محنت کرنے کے عادی نہیں ہیں، ذکی الحس بہت ہیں، موسم کے

تغیرات ہی سے بہت زیادہ اثر قبول کرتے ہیں، چھوٹے چھوٹے
رکیک واقعات جو ہندوستانی سوسائٹی کا طغرائے امتیاز ہیں،
اور جو آئے دن ہوتے رہتے ہیں، کالے خاں کو برہم کرنے کے لئے
کافی ہیں، کالے خاں معاش اور روزگار کی اُلجھنوں سے آزاد ہوکر
اگر ایک فوجدار قسم کی بیوی کے تحت میں آجاتے تو آج اُنکی شہرت
مغرب سے مشرق تک پھیل چکی ہوتی ؛

کالے خاں نے اٹھارہ برس کی عمر سے اُردو میں مضمون نگاری
شروع کی تھی، دس پانچ سال میں سیکڑوں مضامین، افسانے
ڈرامے، تنقیدیں، تبصرے لکھ ڈالے، لیکن اس جگر کاوی کو
ہمیشہ تفریح طبع سمجھا، کسی ایک خاص شعبہ یا صنعت میں یدطولےٰ
حاصل نہ کیا، صرف افسانوں کی جانب اگر ہمہ تن متوجہ ہوجاتے تو
آج ہندوستان کے ایک عدیم المثال افسانہ نگار ہوتے، یا تنقید
و تبصرہ ہی اگر اپنا شعار بنا لیتے تو اپنے ملک اور اپنی زبان کے
مسلم الثبوت سخن سنج اور نقادِ ادب تصور کئے جاتے، طبیعت میں
وہ ہمہ گیری اور جولانی ہے کہ دنیا کا کوئی موضوع اُن کے قلم کی
زد سے محفوظ نہ رہا، عقل اگر دور رس ہوتی اور محنت کی عادت

ہوتی تو اس میں کوئی شک نہیں کہ آج اُردو ادب کے اُستاد مانے جاتے۔

کالے خاں کے ذہن رسا کی داد دیجئے، ام۔اے پاس کرتے ہیں تو ہسٹری میں حالانکہ اس سے پہلے دس برس اُردو کی سیوا میں گزار چکے ہیں اور ہسٹری سے محض اخلاقی تعلق رکھتے ہیں، خیر، اس پر ستم یہ کہ ام۔اے پاس کرکے پھر سہ گونہ جوش وخروش اور سرمستی وسرجوشی کے ساتھ اُردو ہی کی خدمت کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں، اگر عقل ہدایت کرسکتی، اور دل ودماغ محنت پر آمادہ ہو جاتے تو اُس کے بعد بھی اُردو، اور فارسی میں پے در پے ام۔اے کے امتحانات پاس کرتے اور دس سال کے عرصہ میں اُردو تصانیف وتالیفات کا ایک انبار لگا چکے ہوتے، اس کی بجائے کالے خاں نے اپنے آپ کو خود ہی دنیا کا ایک کامیاب انسان گردانا، اور اسی وقار اور تمکنت کے ساتھ زندگی گذارنے لگے، جو ایک کامیاب انسان کے لئے سزاوار ہے، اُن کے جسم کے روئیں روئیں سے یہی صدا آتی تھی۔ "میں کامیاب ہوں .... کامرانی میرے گھر کی لونڈی ہے" حالانکہ کامیابی حاصل کرنا تو کجا وہ کامیابی کے راستہ پر بھی گامزن

نہ تھے :

ہمیں یقین ہے خود فطرت نے کالے خاں کی اس کوتاہ اندیشی پر ماتم کیا ہوگا۔

آج کالے خاں کو اس رکھ رکھاؤ کو قائم رکھتے ہوئے پورے بیس سال گزر چکے ہیں۔ جس جواں مردی اور استقلال کے ساتھ اُس نے یہ جنگ جاری رکھی ہے وہ اسی کا حصہ ہے وہ اپنی ملازمت اور آمدنی کے اعتبار سے ایک نہایت معمولی انسان ہے مگر اس کا یہ ایمان ہے کہ انسان کی بزرگی دولت سے نہیں ہوتی بلکہ علم سے ہوتی ہے۔ اس ایمان پر وہ ایک چٹان کی طرح جما ہوا ہے اور بڑے بڑے کج کلاہوں اور دولت کے خداوندوں سے برابر کی ٹکر لیتا ہے، ایسی ٹکر جس میں ذرا سی بھی تلخی اور بدمزگی نہیں ہوتی، ان ناکامیوں کے بعد بھی مزاج میں شیرینی اور لطافت باقی رکھنا کالے خاں کا حسین ترین شاہکار ہے

کالے خاں نماز نہیں پڑھتے، روزہ نہیں رکھتے، قرآن پاک کی تلاوت اس نے برسوں سے نہیں کی ہے، لیکن ایمان

کے اعتبار سے اللہ کا پرستار، رسول کا شیدائی اور اسلام کی بابرکت تعلیم کا سچے دل سے معترف ہے، ویسے مدتوں نماز نہ پڑھے گا، لیکن جب پڑھے گا تو اس خضوع و خشوع کے ساتھ کہ آسمان پر بسنے والے فرشتے اِس کے حضورِ قلب پر رشک کرنے لگتے ہیں۔ بہت صبح بیدار ہوتا ہے، اکثر تاروں کی چھاؤں ہی میں اُٹھ کھڑا ہوتا ہے، اس وقت اگر اللہ پاک کے حضور میں حاضر ہو کر اپنے خالق سے رجوع ہوتا ہے تو اس کی فروتنی، اس کی عاجزی، اُس کی آہ وزاری دیکھنے کے قابل ہوتی ہے، دیکھنے میں بالکل اَپ ٹو ڈیٹ، مذہب سے کوسوں دُور، لیکن دل کی گہرائیوں میں نورِ عرفاں کا ایک دریا موجیں مار رہا ہے، دنیا اِس کی بے دینی پر خندہ زن ہے، اس کے مذہبی پڑوسی اس کو رحم کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، لیکن وہ ہنستا ہنستا، مستی اور بیخودی کی حالت میں اپنی زندگی کی منزلیں طے کرتا چلا جارہا ہے؛

کالے خاں کے معتقدات میں ایک بڑی افسوس ناک خامی ہے۔ ہمیں اس کا تو علم نہیں کہ اس کی وجہ کیا ہے۔ لیکن ہے یہ ایک ناگوار حقیقت کہ کالے خاں بعض وقت یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ

وہ خدا کے ایک نہایت برگزیدہ بندے ہیں، پنجتن پاک کا اُن پر سایہ ہے، فطرت کی سربستہ قوتیں اُن کی حفاظت کرتی ہیں، فرشتے اُن کی نگرانی اور خدمت کے لئے متعین ہیں، یہ عقیدہ ایک چٹان کی طرح کالے خاں کے معتقدات کا سنگِ بنیاد بن گیا ہے میں اس دنیا میں ایک خاص مشن کے لئے بھیجا گیا ہوں، وقت آئے گا جب میں چمکنا شروع کروں گا، اس وقت میرے پاس دولت بھی ہوگی، رہائش کے لئے ایک عالی شان مکان بھی ہوگا وغیرہ وغیرہ۔

کالے خاں کی بیوی نے جب کبھی مکان کی تنگی کا شکوہ کیا، اولاد کو تعلیم و تربیت دینے کی ترغیب دی، یا گھر کی مالی ابتری کا ذکر چھیڑا تو کالے خاں یہی جواب دیتے ہیں کہ وقت آجانے دو، سارے معاملات درست ہو جائیں گے، ہوش مند بیوی اپنے شوہر کی ابلہ فریبی پر کفِ افسوس ملتی ہے!

بعض دنیا والے کہتے ہیں کہ دنیا آج کا نام ہے کالے خاں کہتے ہیں کہ دنیا کل کا نام ہے، حقیقت یہ ہے کہ کل کا نام دنیا نہیں ہے، کل کا نام جنت ہے!

کالے خاں تخیل کے زور سے اکثر جنت کی حسین وادیوں

اور نظر فریب آبشاروں ہی کے اِرد گرد گھومتے رہتے ہیں، ڈربی کے ٹکٹ خریدتے ہیں، گھوڑ دوڑوں میں بازی لگاتے ہیں "کراس ورڈ پزل" میں طبع آزمائی کرتے ہیں، لاکھ جتن کرتے ہیں کہ جنت ہاتھ آجائے لیکن جنت کل کا نام ہے، کل آج کیسے ہوسکتا ہے؟

کون سی دنیا زیادہ خوبصورت اور دل کش ہے؟ اصلی اور سچی دُنیا یا تخیّل کی؟

اصلی دنیا میں ٹھوس، سنگلاخ اور نہایت ہی کرخت حقیقتیں ہیں، سنگین واقعات ہیں، چٹانوں کی طرح اٹل اور ناگزیر اور پہاڑوں کی طرح وزنی، گراں اور کچل ڈالنے والے۔

تخیل کی دُنیا میں قوس قزح کے رنگ ہیں، خوبصورتی ہے، دل آویزی ہے، سُبک پن ہے، کالے خاں کو کتے نے کاٹا ہے کہ وہ اصلی دنیا سے دل لگائے، اور تخیل کی دنیا سے مُنہ موڑے، وہ حسن اور رنگ و بو کا پرستار ہے، ایسا پرستار کہ وہ رنگ و بو سے لطف اندوز ہونے کے لئے اپنی بہتر سے بہتر دنیاوی آرزو قربان کرسکتا ہے، دن کے چوبیس گھنٹوں میں وہ سات گھنٹے سوتا ہے، خوب مزے لے لے کر سوتا ہے، نیند کے ایک ایک منٹ سے

پورا پورا رس چوستا ہے، پانچ گھنٹے اپنا فرض منصبی ادا کرتا ہے، ڈیڑھ دو گھنٹے روز قومی خدمت کے نذر کرتا ہے، اس کے خیال میں قوم کی خدمت ہر شخص پر واجب ہے یہی اس کا روزہ ہے یہی اُس کی نماز ہے، یہی اُس کے گناہوں کا کفارہ ہے، یہی اُس کا حج ہے اور یہی اُس کی زکوٰۃ ہے، باقی آٹھ دس گھنٹے روزدہ تخیلات کی دنیا میں سیر کرتا پھرتا ہے ایسی شان بے نیازی کے ساتھ گویا کیوپڈ اپنا تیر کمان لئے کوہ البیس کی سرسبز و شاداب وادیوں میں مصروف گل گشت ہے، دنیا پھر آخر کار دنیا ہے، دُنیا کی کردہات کھینچ کھینچ کر اکثر کالے خاں کو زبردستی عالم خیال سے حقیقت کی جانب لے آتی ہیں، خاں صاحب کی حالت اس وقت دیکھنے کے قابل ہوتی ہے، اُن کا دماغ لہولہان ہو جاتا ہے، گویا کسی نے اُسے کانٹوں میں گھسیٹا ہے، اُس کے خیالات میں ایک تہلکہ مچ جاتا ہے، اُس کی زندگی کی کشتی زیر و زبر ہونے لگتی ہے اور رہ بچوں کی طرح رونے پر آمادہ نظر آتا ہے۔

کالے خاں تسکار نہیں کھیل سکتے، اس میں عمل ہے تخیل کی گنجائش نہیں، تاش سے اُسے کوئی دلچسپی نہیں لیکن شطرنج کا وہ بادشاہ ہے، سینما بڑے ذوق شوق سے جاتا ہے، بشرطیکہ

سینما،، گویا،، نہ ہو، تیز میل ٹرین میں بڑے شوق سے سفر کرتا ہے، کیونکہ ایسے سفر میں تخیل کی دنیا جلد جلد بدلتی رہتی ہے، پیدل چلنا کالے خاں پر ایک مصیبت کا پہاڑ ہے، قدم کی تیزی تخیل کی تیزی کی برابری نہیں کر سکتی !

اللہ خوش رکھے، کالے خاں محبت، اخلاص اور راستبازی کے پتلے ہیں، باتوں میں اُن کی ایک لوچ ہے، ایک کشش ہے ایک خاص جاذبیت ہے، اُمید کی ایک خاص جھلک ہے، جو دلوں پر ضرور اثر کرتی ہے ؛

آیئے، آج کالے خاں سے ذرا مل آئیں، اور دیکھیں کہ آج وہ تخیل کی کونسی وادی میں مصروف گل گشت ہے ؟

باجی

باجی جان کی عمر کوئی چالیس پینتالیس کی ہوگی، بہت زود فہم، تجربہ کار، ہر فن مولا، ہنس مکھ، اور ہمدرد ہیں، فلکِ کجرفتار انکو بہت کچھ ستا چکا ہے، زمانہ کے سرد و گرم بہت دیکھ چکی ہیں، مدتوں دولت کے زرّیں اور مرصع جھولوں میں جھول چکی ہیں، تنگ دستی، اور افلاس کے ہوش ربا مناظر سے بھی بہرہ وافر پایا ہے، اب وہ زندگی کی اس منزل میں ہیں جہاں نہ دولت کا اثر ہوتا ہے اور نہ تنگدستی کوئی تغیّر پیدا کر سکتی ہے، اغلباً یہ اُن کے مزاج اور ماحول کا مجموعی نتیجہ ہے کہ اُن کی آواز میں گداز، دل میں ہمدردی اور لہجہ میں شیرینی پیدا ہوگئی ہے، باتیں اس قدر دلکش اور

دل پذیر انداز سے کریں گی کہ سننے والے اور خصوصاً عورتیں ان کی مُرید ہونے کے لئے تیار ہو جائیں گی، اور گھنٹوں باجی کے اِرد گِرد حلقہ بنائے بیٹھی رہیں گی،

اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ باجی بڑی باہمت اور خود دار ہیں، اُن کے شوہر نے پہلے ایک عورت سے عشق کیا اور پھر اُس سے نکاح کر لیا، باجی نے شوہر اور اُن کی مدخولہ دونوں پر لات ماری اور اپنے گھر واپس آگئیں، یہاں آکر پڑھنے لکھنے کی طرف متوجہ ہوئیں، سینگ کٹا کر بچھڑوں میں داخل ہوئیں، اور چار پانچ درجہ انتہائی بے سر و سامانی کے باوجود پاس کر ڈالے، لیکن کسی نے سچ کہا ہے، بوڑھے طوطے کیا پڑھ سکتے ہیں، عمر کے ابتدائی حصے میں لہجہ، تلفظ، آواز اور دماغ ہر سانچے میں ڈھالا جا سکتا ہے، چالیس کے بعد یہ بات بہت دشوار ہو جاتی ہے، چنانچہ باجی کے معاملہ میں ہمیں اس بات کا پورا تجربہ ہو گیا، انگریزی کو تعابو میں نہ لا سکیں، حساب کی پیچ در پیچ گتھیاں سُلجھانا جوئے شیر کا لانا ہو گیا، بہت سر کھپایا، ہاتھ پاؤں بہت مارے لیکن باجی جان کی تیزی و طراری اس میدان میں اُن کو کامیاب نہ کر سکی، دو تین مرتبہ مڈل کے

امتحان میں جب گدّے کھا چکیں تو جبل پور نارمل گرلس اسکول میں داخل ہوئیں اس مرتبہ ورناکیولر مڈل کا امتحان دیا اور ساتھ ساتھ سلائی کی سند بھی حاصل کی، جبل پور کی طالبات میں ایک خاص ہر دل عزیزی اور محبت پیدا کرکے مئی کے شروع میں اپنے وطن واپس ہوئیں، ایسی سج دھج سے کہ دیکھنے والے انگشت بدنداں رہ گئے!

بہت عمدہ سفید شفاف غرارہ، اُس کے پائنچے پر خوبصورت بیل ٹکی ہوئی، آب رواں کا ستھرا کرتا، جس پر بہت گھنی گھنی کامدانی کی گئی تھی، چہرہ پر زرّیں تال کی عینک، اور پاؤں میں ایک نہایت پُرتکلف سینڈل، دانت منجھے منجھائے، چال میں وہ بانکپن، گفتگو میں وہ لوچ وہ شیرینی کہ سننے والے حیرت زدہ ہو جائیں۔

———— (❂) ————

ساڑھے بارہ بجے میں گشت سے واپس ہوا، پسینہ میں شرابور تھا، چہرہ اور کپڑوں پر گرد کی تہ جمی ہوئی تھی، کمرے میں داخل ہوا ایک عجیب منظر نے میرا خیر مقدم کیا!

فرش کے قالین پر باجی اپنی کتھا سنا رہی ہیں اور اُن کے ارد گرد گھر کی ساری آبادی حلقہ بنائے ہوئے بیٹھی ہے، برابر والے

کمرہ میں ماما نے میز پر کھانا چن دیا اور تقریباً پانچ منٹ بعد غسل خانہ سے نکل کر میں کھانا کھانے بیٹھ گیا، کھانا تو میں ضرور کھا رہا تھا لیکن میرے کان باجی جان کی داستان پر لگے ہوئے تھے، میں نے یہ معلوم کرنا چاہا کہ آخر ان کی تقریر میں وہ کون سی دل کشی اور چاشنی ہے جو ہر عمر کی عورتوں اور بچوں کو اس قدر لبھاتے ہوئے ہے؛

"گاڑی تو پانچ بجے چلتی ہے، لیکن بھیا! ہم لوگ تو دو بجے ہی اسٹیشن پر آ گئے تھے۔"

"کیوں؟ دو بجے کیوں آ گئیں"

"بورڈنگ کاٹے کھانے کو دوڑ رہا تھا"

"اوئی، اللہ!"

"رات ہی جج صاحب کے مکان میں ڈاکہ پڑا تھا۔"

"کون سے جج صاحب؟"

"ہمارے بورڈنگ کے سامنے رہتے ہیں، بے چارے بڑے اچھے آدمی ہیں"

اس تمہید کے بعد ڈاکہ کی تفصیل، ڈاکوؤں کے حلیے، ان کی تلواروں اور بندوقوں کی تابناکی، ان کا گھر پر حملہ آور ہونا، بندوق کے دل خراش فیر، ڈاکوؤں کے مظالم؛ وہ سنگدلی کی حرکات اس

قدر شرح اور بسط کے ساتھ بیان کی گئیں کہ سننے والے خوف سے کانپنے لگے اور ہر فرد بشر سکتہ کی حالت میں انگریزی حکومت کی نااہلی اور لاپرواہی کے راگ الاپنے لگا:

میں کھانا کھانے میں مشغول تھا، میں نے دل میں کہا،

"یہ ایک ہوئی"

....

میں نے دو تین پان کھائے، تمباکو کے سرور سے لطف اندوز ہو رہا تھا، صبح کی ڈاک، کھانے کی میز پر پڑی ہوئی تھی، خطوط پڑھنے کے بعد میں اخبار پڑھنے لگا، اور مقالہ افتتاحیہ میں اس قدر محو ہوا کہ مجھے ہوش تک باقی نہ رہا، معاً برابر والے کمرے سے "توبہ" توبہ" "یا اللہ" کی اس قدر دل ہلا دینے والی اور ہوشربا آوازیں آئیں کہ میرے کان کھڑے ہو گئے، حواس جمع کرنے کے لئے میں نے دو پان پھر کھائے، اب میرے ہاتھ میں اخبار تھا اور میں پھر باجی جان کی باتیں غور سے سُن رہا تھا۔

"رات کے کوئی دو یا تین بجے ہوں گے"

"اوئی! دو بجے رات کے"

"ہاں، شاید حد سے حد تین بجے ہوں، اسد ملیہ نکل چکا تھا"

"زاہدہ۔ ذرا ایک پان دینا"

"اے ہے! باجی!! تمہارا تو حلق سوکھ گیا ہوگا، پان لاؤ، جلدی سے"

"جنگل بیابان میں ریل یکدم کھڑی ہوگئی، اور اس قدر رونے چیخنے کی آوازیں آئیں کہ کان پڑی آواز سُنائی نہ پڑتی تھی"

"میرے اللہ"

"معلوم ہوا کہ ریل میں ایک ہندو ماڑواڑی کی برات سفر کر رہی تھی، کسی طرح سے زنانہ درجہ کا پٹ کھُل گیا اور نئی بیاہی دُلہن ریل کے نیچے گر پڑی"

"اُفوہ! پھر کیا ہوا؟"

اس کے بعد پھر اُسی دل کش انداز میں اس بدنصیب دُلہن کی جوانی اور خوبصورتی کی تصویر بیان کی گئی، سوتے میں اُس کا گرنا، گر کر اُس کے سر کا پاش پاش ہونا، اُس کے معصوم اور بلوریں اعضا کی تفصیل، اپنے ماں باپ کی اکلوتی ہونا، تعلیم اور تہذیب میں یگانۂ روزگار ہونا۔ اس کے شوہر کا دھاڑیں مار مار کر رونا پیٹنا، اور جنگل کو نکل جانا اور دو نہایت متمول اور بہترین تعلیم یافتہ خاندانوں کے چراغوں کا گُل ہو جانا، باجی جان

کی زبان بڑی روانی کے ساتھ فراٹے بھر رہی تھی، اور اُن کے سامعین کی مختصر سی جماعت اس لڑکی کی نعش پر سینہ کوبی کر رہی تھی؛

اللہ الصمد! کیسا دَردناک منظر تھا، اور معصوم و خوش عقیدہ عورتوں کی الم انگیز آہیں کس قدر سبق آموز تھیں؟

اخباروں اور خطوں کو چھوڑ کر میں بھی کسی سوچ میں پڑ گیا کئی منٹ کے بعد میں کھانسنے لگا، میرا حلق خشک ہو گیا تھا بمشکل میری زبان سے یہ لفظ نکلے۔

"یہ دوسری ہوئی"

کوئی چھ بجے ہوں گے، میں نہا دھو کر کھانے کے کمرے میں آیا، گرمی شباب پر تھی، میں نہا چکا تھا، لیکن پسینہ ایک منٹ کو نہ تھمتا تھا۔

ایک کشتی میں ناشتہ کا سامان لے کر باجی داخل ہوئیں اور سامنے والی کرسی پر بیٹھ کر میری تواضع کرنے لگیں۔

"آپ ہماری مہمان ہو کر ہمیں شرمندہ کر رہی ہیں"

"اس میں شرمندگی کا ہے کی ہے"

"جی"

"میں تو اسے اپنا گھر سمجھتی ہوں"

"اب آگے کی کیا سوچی ہے؟"

"آگرہ میں جگہ ہے، مگر میں وہاں ہرگز نہ جاؤں گی"

"کیسی جگہ؟"

"بورڈنگ کی میٹرن، پچھتر روپیہ ماہوار، مکان اور کھانا، گورنمنٹی ملازمت!"

"جی!! آپ کو ضرور کر لینا چاہیئے"

"جی نہیں، میں کیا کرتی!"

"پھر کیا کرو گی؟"

"جو قسمت میں ہوگا"

"کہیں اور کوئی بندوبست ہے؟"

"کہیں بھی نہیں۔ بس اللہ کا نام ہے"

میں چار اور ناشتہ سے فارغ ہو چکا تھا، کئی منٹ تک میں باجی جان کے دماغ کی ساخت اور ترکیب پر غور کرتا رہا، کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا، میں نے پان کھائے اور دل میں،

"یہ تیسری ہوئی!!"

کہتا ہوا باہر چلا گیا ——————

سقوطِ اِشتہا

حسن میاں کی دلچسپ، اور دل نشین داستان بیان کرتے ہوئے میرے دل میں ایک جھجھک سی، ایک خفیف سا تامل پیدا ہونے لگتا ہے، کیونکہ اُن کے اور میرے تعلقات کچھ عجیب معجونِ مرکب ہیں، گو ہم جماعت تھے، لیکن عمر میں وہ مجھ سے چار پانچ سال بڑے ہیں چہرے مہرے سے وہ بہت کم عمر معلوم ہوتے ہیں۔ اس پر طرّہ یہ کہ رشتہ میں وہ میرے عموئی نامدار ہیں، نہ صرف یہ بلکہ اُن کو اپنے چچا، اور میرے بھتیجے ہونے کا شدید احساس ہے، ایسا احساس جسے وہ کبھی فراموش نہیں کرتے، کبھی نہیں بھولتے، اور میری کوشش کے باوجود مجھے بھی بھولنے نہیں دیتے:

اس بہ ظاہر سنگین اور بہ باطن نہایت دلکش پیچیدگی کے علاوہ حسن میاں کی طبیعت کی اُفتاد کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ اپنی شکل و صورت اور سج دھج کی کم مائگی کے باوجود وہ یا تو ہر وقت بھوکے ہونگے یا خواہ مخواہ اپنے آپ کو اپنی بیوی، بچوں، دوست، احباب، اعزا، محلہ والوں اور دفتر کے ہمکاروں کا محسن و مُربی تصور کرتے رہیں گے اور جا و بے جا اپنے بے پناہ جذبۂ ترحم کا مظاہرہ کرتے رہیں گے۔

حسن میاں سے جو اربابِ نظر اچھی طرح واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ اگر ان کی ذات والاصفات میں سے ان کی دائمی بھوک اور ان کے جذبۂ مربیانہ کو خذف کر دیا جائے تو پھر وہ

حیاتِ مستعار کا ایک ورقِ سادہ،
زندگی کی آگ کا ایک بجھا ہوا انگارہ،

یا

مٹی کا ایک بے آب و گیاہ تودہ

نظر آنے لگیں، مجھے مہینوں بلکہ برسوں حسن میاں کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا لیکن میں نے سوتے، جاگتے، اُٹھتے، بیٹھتے ان کو یا تو ہمیشہ بھوکا پایا، یا شدید جذبۂ ترحم سے آتش زیر پا اور پھر لطف یہ کہ حسن میاں کی بھوک کوئی معمولی بھوک نہیں ہوتی جو آسانی سے یا تھوڑی

سی دقت سے برداشت کر لی جائے، بلکہ ایسی قاتل اور مہلک بھوک جس میں کلیجہ ٹوٹنے لگتا ہے اور انسان پر نزع کی حالت طاری ہو جاتی ہے، اور یہ تو ظاہر ہے کہ ان کی بھوک جس قدر شدید ہوتی ہے اسی قدر ان کا جذبۂ ترحم عمیق اور عالمگیر ہوتا ہے، اس لئے حسن میاں پر بھوک اور جذبۂ ترحم کا غلبہ ہر لحظہ طاری رہتا ہے،

جاڑا، گرمی، برسات حسن میاں ہمیشہ پانچ بجے صبح اُٹھنے کے عادی ہیں، فجر کی نماز اور قرآن پاک بڑی عقیدت سے پڑھتے ہیں، اُن کا یہ ایک اصول ہے کہ بغیر کچھ کھائے پیئے گھر سے باہر نہ نکلو، اگر اس اصول پردہ کاربند نہ ہوتے تو فجر کی نماز مسجد ہی میں ادا کرتے۔ اس بارے میں حسن میاں کے احباب میں اختلافِ آرا ہے کہ اُن کو صبح کی نیند نماز کی وجہ سے پیاری نہیں ہے یا صبح کو ان کا کلیجہ اس قدر ٹوٹنے لگتا ہے کہ اُن کو طوعاً و کرہاً بیدار ہی ہونا پڑتا ہے۔

کچھ لوگ نماز روزہ کے خیال سے پو پھٹنے سے پہلے بیدار ہو جاتے ہیں، کچھ لوگ صحت کے خیال سے علی الصباح چہل قدمی کرنے گھروں سے نکل جاتے ہیں، دو چار اصحاب ایسے ملے جو تازہ اخباروں کے فراق میں صبح تڑکے بستر چھوڑ دیتے ہیں، اور ناشتہ کئے، اور ہاتھ منہ

دھوئے بغیر اخباروں کے صفحات میں گھنٹوں کے لئے پیوست ہو جاتے ہیں مگر اس بارے میں تلاش و تحقیق کے باوجود کوئی حتمی رائے نہیں پیش کی جاسکتی کہ حسن میاں کو علی الصباح بیدار ہونے پر کون مجبور کرتی ہے، بھوک، یا نماز،

حسن میاں نے عالم شباب میں ضرور ،،سوٹ فرمائے،، اور گھنٹوں اپنی طلعت زیبا، اور جامہ زیبی کا معائنہ آئینہ میں کیا ہو لیکن اب دہ برسوں سے علی گڑھ کٹ کے پاجامے، اور دلی کی اچھی سلی ہوئی قیمتی شیروانیاں ہی پہنتے ہیں، انگریزی بولنے پر بہت کم قادر ہیں گو ضابطہ کی انگریزی لکھنے کی مشق ہو گئی ہے علاوہ ازیں میلانات اور رجحانات کے اعتبار سے ٹھیٹ مشرقی ہیں لیکن علی الصباح چند منٹ کے لئے وہ بالکل انگریز بن جاتے ہیں فرق صرف اس قدر رہے کہ انگریز کی ،،بڈ ٹی،، میں صرف چائے کی ایک پیالی اور کسی پھل کے ایک یا دو دانے ہوتے ہیں، اور حسن میاں کی اس چائے کے ساتھ ساتھ گھنے مکھن میں لپٹی ہوئی چند مجونیں اور آدھ پاؤ انگور ہوتے ہیں۔

انگریز اس کے بعد سیدھا غسل خانہ جاتا ہے اور وہاں سے نہا دھو کر تازہ دم واپس آتا ہے، لیکن حسن میاں غسل سے پہلے

وہ بعد کو دیر تک اپنی بدخوابی اور سوءِ ہضمی کی شکایت کرتے رہتے ہیں، انگریز ہنستا، کھلکھلاتا ہوا اپنی بیوی، اور بچوں سے خوش گپی کرتے ہوئے اخبار پڑھتا ہے، اور حسن میاں ٹھنکتے، من مناتے، زمانہ کی رفتار کی شکایت کرتے۔ اور فلک کی کجرفتاری پر نوحہ کرتے ہوئے اپنے دن کی ابتدا کرتے ہیں، لیکن یہ بات فراموش کرنا چاہیئے کہ حسن میاں کے خیال میں

زمانہ کی رفتار کی شکایت = بھوک نہ لگنے کی

اور

فلک کی کجرفتاری کا نوحہ = سوءِ ہضمی کی

ان کو اس سے کوئی سروکار نہیں کہ مشرقِ بعید میں کیسی قیامت خیز پیچیدگیاں پیدا ہو رہی ہیں، نہ ان کو اس سے کوئی واسطہ کہ "اقیانوسی چارٹر" کے ساتھ ساتھ "بحرالکاہل کا چارٹر" بھی عالمِ وجود میں آنا چاہیئے تاکہ جمہوریت کا زرّین نصب العین مشرق اور مغرب دونوں پر یکساں اثر انداز ہو سکے، اور نہ ان کو اس کی پرواہ کہ یورپ کا مجاور پھر لنگوٹی میں پھاگ کھیلنے پر کمر بستہ ہے، اور خدا جانے یہ "سیلابِ بلا" ہندوستان کی سیاست کو کہاں سے کہاں لے جائیگا

ٹھیک ساڑھے چھ بجے حسن میاں ناشتہ کی میز (بریکفسٹ ٹیبل)

پر آموجود ہوتے، لیکن بہ ظاہر کس انداز سے آتے ہیں

جیسے چھ مہینہ کا مریض کسی حکیم کو نبض دکھانے جاتا ہے

یا

جیسے کوئی مجرم عدالت کے روبرو پیش ہوتا ہے

یا

جیسے بارش میں بھیگی ہوئی بلی کسی کمرے میں پناہ لیتی ہے

حسن میاں کے ارد گرد ان کی کثیر التعداد اولاد حاشیہ نشین ہوتی

ہے، اور سب لوگ دادِ شجاعت دینے پر کمر بستہ نظر آتے ہیں۔ حسن میاں کھانا کھا لینے میں غیر معمولی دیر نہیں لگاتے، اور نہ کچھ زیادہ کھاتے ہیں، یہی دس پندرہ منٹ میں فارغ ہو جاتے ہیں لیکن اتنی ہی قلیل مدت میں وہ اس قدر کھا لیتے ہیں کہ دوسرے کو دو دن میں کھا لینے کے لئے منہ چاہیئے۔ یہی دو تین پیالی چا، آدھ پاؤ بالائی، تین چار انڈے، دو پراٹھے، دو تین شامی کباب اور ایک آدھ حلوے کی پلیٹ، اور یہ سب کچھ کھا چکنے کے بعد ورق طلائی کے ساتھ معجون کے دو چمچے، اور پھر

وہی ٹھکنا، دہی بن بنانا، دہی شکائتیں اور دہی نوحے

اور ساڑھے نو بجے دفتر کے وقت دہی غیر مربوط تقریر،

"لاحول ولا قوۃ .... (ڈکار لیتے ہوئے) رات بدلو آیا تھا، اس کی صورت تو اب دیکھی نہیں جاتی ...... بیوی بیمار، آزاری، دکھیاری، اولاد کمبخت کی کثرت ناداری، افلاس .... اور ہاں! رات یہ چھبن کی لڑکی کیوں روتی رہی .... لاحول ...... پرسوں سے بھوک بالکل غائب ہے .... نہ کچھ کھایا جاتا ہے ... نہ کچھ ہضم ہوتا ہے .... کس قدر مصیبت میں جان ہے !!! "

گیارہ بجتے بجتے حسن میاں اپنے دفتر پہونچ گئے اور اپنی ترکی ٹوپی میز پر رکھ کر حاضری کے رجسٹر میں دستخط کئے، اور کرسی پر بیٹھ کر اپنی صحت کا جائزہ لینے لگے، "دو مہینہ میں ۶ پونڈ میرا وزن کم ہو گیا ہے ...... سقوطِ اشتہا نے کہیں کا نہ رکھا۔ میرے خیال میں اب مجھے کچھ دنوں کے لئے ہومیو پیتھک علاج شروع کرنا چاہیئے، یہ ڈاکٹری اور طبی بہا تو اب ہو چکی!"۔ اسی اثنا میں میز پر قرینہ سے لگے ہوئے مسلوں کے انبار پر جو نظر پڑی تو طویل رخصت کے لینے کا خیال آیا، پھر سوچنے لگے "جنگ کا زمانہ ہے، بھلا رخصت کیسے ملے گی؟"

کوئی رحمدل افسر یا ماتحت اُدھر سے اگر آ نکلا اور اُس نے اُن کے چہرے کے اُڑے ہوئے رنگ اور پیشانی کی تاریکی کو اگر ذرا بھی غور سے دیکھ لیا تو اُن سے اپنی صحت کے بارے میں ایک لا متناہی گفتگو کرنے لگے اور تقریباً بارہ بجتے بجتے دفاتر کے تمام شعبوں کا جائزہ لینے چل کھڑے ہوئے۔ اس تمکنت، خودنگہداری اور شانِ رعنائی کے ساتھ جیسے کمانڈر اِن چیف اپنی فوج کے مختلف دستوں اور کمپنیوں کا معائنہ کرتا ہے، اور پھر لطف یہ کہ ہر جگہ زمانہ کی بے راہ روی کی شکایت اور فلک کی کجرفتاری کا دلدوز نوحہ، یعنی بھوک بالکل نہیں لگتی، اور جو کچھ تھوڑا بہت تولہ، دو تولہ زہر مار کر لیتا ہوں وہ کلیجہ پر رکھا رہتا ہے اور حلق میں جلن ہوتی رہتی ہے

لیکن

اس کے ساتھ ساتھ ہر شخص کے دُکھ درد میں شریک، ہر شخص سے خلوص و محبت کا اظہار جہاں کہیں کسی کی تکلیف یا مصیبت، دُکھ یا درد کی گرمی دیکھی اور حسن میاں کا دل پگھلنے لگا۔

بارہ بجتے بجتے حسن میاں کا پوسٹ کارڈ، "بواتے سردنٹ)

ایک بڑے سے مراد آبادی منجھے منجھائے ناشتہ دان میں "صاحب"

کا کھانا لے آیا۔ حسن میاں نے ترکی ٹوپی میز پر چھوڑی، اور ناشتہ دان لیکر برابر والے "رسٹوران" میں پہونچ گئے، بہت دردآفریں لہجہ میں منیجر سے اخلاق فرمایا، ویٹروں سے نام بنام خیریت پوچھی، ان کی سُنی، اپنی سُنائی، اور "اتفاقاً" یہ معلوم کرکے کہ آج "فادل کری" تیار ہے حسن میاں کے جسم کا رواں رواں شکرایزدی بجالانے لگا، اگرچہ اُنکو معاً یہ یاد آجاتا کہ ان کو نہ بھوک لگتی ہے، اور نہ کھانا ھضم ہوتا ہے، پھر بھی ویٹروں کی دل شکنی منظور نہ تھی ایک پلیٹ کری مانگ ہی لی، اور اپنے خانہ ساز ساز وسامان کے ساتھ کری کو بھی شامل کرلیا، اور دس بارہ لبالب پلیٹیں سامنے رکھ کر "سقوط اشتہا" کی گتھی کو سلجھانے لگے، ایک ویٹر نے پسا ہوا نمک اور مرچ سامنے رکھی، دوسرا برف کا پانی بنانے لپکا، تیسرا آکر ہمکلام ہونے لگا۔

حسن میاں! "وہ تمہارا بچہ اب کیسا ہے؟"

ویٹر۔ (خندن) "اب تو اچھا ہے، سرکار، مگر......"

حسن میاں۔ "مگر کیا؟"

ویٹر۔ "اگلے مہینہ لڑکی کی شادی ہے"

"ارے۔ اتنی جلدی"

"سرکار، اب تیرھویں میں لگ گئی ہے"

مرغ کا گوشت نوچتے ہوئے

"ارے کم بخت گلا ہی نہیں"

"سرکار، پکایا تو بہت تھا"

"کیا خاک پکایا۔

کچھ وقفہ کے بعد بسورتے ہوئے،

اِس برسات میں مکان گر گیا اوپر سے بنّن کی شادی درونے لگتا ہے) حسن میاں کا دل لرز جاتا ہے، اُن کی آواز بھرّا جاتی ہے بمشکل کھانا ختم کرتے ہوئے پوسٹ کارڈ سے مخاطب ہوتے ہیں،

"کم بخت آج تو نے سارا اَبھی گرا دیا...... ناشدنی، مردود کل سے اگر ایسا کیا تو کان اُکھاڑ لوں گا"

تھوڑی دیر بعد، پوسٹ کارڈ ایک چمکتی ہوئی اکنی اُچھالتے ہوئے بیرنگ جا رہا تھا، اور دیہڑوں میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ آج خُدن نے پالا مار لیا حالانکہ برآمدے میں کھڑے ہوئے حسن میاں اپنے ایک دوست سے اب تک اپنی سقوطِ اشتہا اور سوءِ ہضمی کی شکایت کر رہے تھے،

چھوٹے

اب چھوٹے کی عمر سولہ، سترہ سال کی ہوگی، لیکن قد و قامت کے لحاظ سے وہ اب تک لڑکا ہی معلوم ہوتا ہے، اس مرتبہ وطن جاکر جو ذرا غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ مسیں خوب بھیگ چلی ہیں، اور سیاہ تاب، پیلے گالوں پر سبزہ رونما ہونے لگا ہے۔ اگرچہ بعض صاحبان کا یہ حال ہے کہ وہ کافی عرصہ تک "کلین شیو" کرتا رہا، اور کافی مدت تک یہ پتہ نہ چل سکا کہ چھوٹے ریش و بروت سے آراستہ ہو چکا ہے۔ قد و قامت میں فطرت نے اس کے ساتھ فیاضی نہیں کی، ایک مختصر سی بلندی پر پہنچکر اُس کی اونچائی ندرت رُک گئی ہے بلکہ سال بہ سال اُس کے قد میں بجائے بلندی پیدا ہونے کے کچھ کمی ہی واقع ہوجاتی ہے، اس لئے دُور سے

وہ اب تک ایک فربہ اندام "لونڈا" معلوم ہوتا ہے مگر قریب آنے پر اسکے چہرے پر پختگی، مردانگی، اور کرختگی کے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں۔

تقریباً سات آٹھ سال ہوئے کہ چھوٹے نے میرے ہاں ملازمت اختیار کی تھی، لیکن اس ملازمت کی نوعیت کچھ عجیب سی تھی، صبح تڑکے آتا، صحن اور کمرے صاف کرکے جھاڑ د، بہار دسے فارغ ہوکر اپنے مدرسے چلاجاتا، بارہ بجے واپس آکر کھانا کھاتا، اور پھر شام تک میری نوکری کرتا ہاتھ میں اُس کے ناگری کی کتاب ہوتی، کام سے فرصت ملتی تو پڑھنے لگتا، اور پڑھنے سے جی اُکتاتا تو کام کرنے لگتا۔ نہ کام کرنے کی زیادہ فرمائش ہوتی، اور نہ پڑھنے لکھنے پر اسے زجر و توبیخ کی جاتی۔ دونوں کام اُن کی مرضی پر چھوڑ دیئے گئے تھے، جب چاہو کام کرو، اور جب جی چاہے پڑھو، مگر اس میں شک نہیں کہ گو چھوٹا مائل بہ فربہی تھا لیکن کام کرنے اور پڑھنے میں وہ کاہلی نہ کرتا، دونوں کام ایک خاص توازن اور ایک مخصوص سنجیدگی اور متانت کے ساتھ انجام دیتا۔

بعض لوگ ہر کام شور و شغب کے ساتھ کرنے کے عادی ہوتے ہیں چھوٹے کا دستور اس کے خلاف تھا، اس کی دن رات یہ کوشش ہوتی کہ وہ خود کسی طوفان کا باعث نہ بنے زمانہ کی رَو صلح و آشتی کے ساتھ بہتی رہے، اس کے ماحول میں شانتی اور سکون کا دور دورہ ہو،

چنانچہ بارہ بجے وہ اسکول سے واپس آتا تو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی چپکے سے دبے پاؤں آتا اور ایک کونہ میں فروکش ہو جاتا۔ کسی سے نہ پیام نہ سلام، نہ کچھ کہنا، نہ کچھ سننا، کسی کام کے لئے اُس کی خدمات کی اگر ضرورت پڑتی تو آواز دینے پر یکایک نمودار ہو جاتا اور چپکے سے کام کر کے پھر خلوت میں چلا جاتا، اس قدر شرمیلا تھا کہ فرصت کے اوقات میں کونہ میں چھپا بیٹھا رہتا۔ کھانا اگر کھاتا تو پوشیدہ ہو کر، اگر سوتا تو تنہائی میں، کھلکھلا کر تو وہ کبھی نہ ہنسا، صرف خندۂ زیرلبی کا قائل تھا اور وہ بھی اس نزاکت سے کہ کوئی ناکتخدا لڑکی بھی وہ نزاکت اور خجالت نہ دکھا سکتی تھی۔

چھوٹے میں ایک اور خوبی تھی، حالانکہ بعض اوقات یہ خوبی ایک بہت بڑی خرابی معلوم ہونے لگتی، وہ بلا کا کم گو تھا، کم گو نوکر بہت بہتر ہوتا ہے لیکن چند در چند صورتوں میں یہ کم گوئی سخت اذیت کا موجب بن جاتی ہے اور جی چاہنے لگتا ہے کہ اپنا اور ملازم دونوں کا سر دیوار سے ٹکرا دیا جائے، مثلاً آپ کہیں سے واپس آئے اور ملازم نے اطلاع دی کہ آپ سے ملنے ایک صاحب آئے تھے، سیاسی یا معاشرتی سلسلہ میں آپ سے کئی صاحبان ملنے آسکتے ہیں اور آپ اس اُلجھن میں پڑے ہیں کہ خدا جانے کون ہوں۔ آپ سوال پر سوال کرتے

جا رہے ہیں اور ہر سوال کا جواب کم گو ملازم نامکمل جملوں میں دے رہا ہے آپ کے دل کی خلش، دماغ کی اُلجھن بڑھتی جاتی ہے لیکن کم گو ملازم آخر میں نہ صرف چپ ہو جاتا ہے بلکہ آپ کے دماغی انتشار سے اُسے ایک قسم کی چڑھ سی ہو جاتی ہے۔ سات آٹھ سال کے عرصہ میں ایسے موقعہ بہت سے آئے، اور ہر مرتبہ جی چاہا کہ کم گو ملازم کی زبان گُدّی سے کھینچ لی جائے۔

چھوٹے کے سلسلہ میں ایک بات اور عرض کر دینا ضروری ہے، وہ امید ھکار کی اُمت کا ایک رُکن ہے اس لئے اس کو ملازم رکھنا میرے لئے گوناگوں سماجی، اور معاشرتی پیچیدگیوں کا موجب ہوا اعزا نے ملنے جُلنے میں پرہیز کرنا شروع کر دیا، دوست احباب ناک بھوں چڑھانے لگے، ایک بزرگ نے میرے ہاں کا کھانا، پینا اپنے اوپر حرام کر لیا، مردوں میں مخالفت اور عورتوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں اور میری مذہبی آزادی اور بے راہ روی کے قصوں میں چھوٹے کے افسانہ نے ایک خاص اہمیت حاصل کر لی، میں نے ان تمام نکتہ چینیوں کو اپنے دامنِ ہمدردی میں لیا، اُن کی طرف سے مجھ پر لعن طعن کی بوچھار ہوتی، فقرے چُست کئے جاتے لیکن میں اس کے

جواب میں ان کی تنگ نظری سے متاثر ہو کر اپنے دل میں رحم کے جذبہ کو پرورش پاتا ہوا دیکھتا، اور دل ہی دل میں کہتا۔

"اس تنگ نظری کا اس دنیا میں .... ہندوستان کی دنیا میں کیا علاج ہے" ؟

یہ کش مکش سات آٹھ سال تک جاری رہی، اور اس اثنار میں چھوٹے ایک شریف، خواندہ، صاف، ستھرا لڑکا ہو گیا۔ مجھے اسکی خودداری دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی، کم گو، اور سنجیدہ تو وہ پہلے ہی سے تھا، اس کے ساتھ ساتھ عزت نفس، اور صفائی اس کی شخصیت میں پیوست ہو گئیں۔ اور اس سماج کا وہ ایک باکار، اور مفید رکن بن گیا۔

چھوٹے کا باپ ایک اسکول میں چوکیدار تھا اور اس کی ماں اور دو چار بھائی بہن پندرہ روپیہ ماہانہ میں زندگی گذارتے تھے، ظاہر ہے کہ اس گرانی کے زمانہ میں ان کی بڑی مشکل سے گذر ہوتی تھی، روزانہ مصارف کے علاوہ تیج، تیوہار، ملنا، جلنا، شادی برات بھی ہوتے رہتے اور جہاں تک مجھے علم ہے چھوٹے کا خاندان اکثر بنئے، اور کبھی کبھی کسی "پٹھان"، کا مقروض ہو جاتا، اور جب ادائگی کا وقت آتا تو چھوٹے کا باپ مجھ سے قرض مانگتا۔ وہ وقت چھوٹے پر بڑی سختی کا گذرتا، جسے سکو (اس کا باپ)

روپیہ مانگنے میں یگانۂ روزگار تھا، دنیا دیکھے ہوئے، زمانہ کو برتے ہوئے عسرت اور تنگدستی کے مزے چکھے ہوئے، پہلے وہ چھوٹے کے ذریعہ اپنا مدعا مجھ تک پہنچاتا، لیکن چھوٹے نے ہزار با تقاضوں اور دھمکیوں کے باوجود بھی یہ پیام کبھی مجھ تک نہ پہنچایا۔ اس کے بعد جیسکھ خود وارد ہوتے، ہاتھ میں بڑا سا لٹھ، پنڈلیوں پر گھسی ہوئی سال خوردہ پٹیاں بندھی ہوئیں، سر پر میلا صافہ، میں چک میں سے اُن کو وارد ہوتے دیکھتا، اُن کا مدعا سمجھ جاتا، وہ آتے ہی ایک کراری آواز میں چھوٹے کو پکارتے، دو تین پے در پے آوازیں دیتے اور جواب نہ پاکر صحن کی منڈیر پر اکڑوں بیٹھ جاتے، اور بیٹھتے ہی ایک ایسی جگر دوز آہ کھینچتے کہ مردانے کے دیوار و در ہل جاتے، اور گھر کے ہر فرد کو معلوم ہو جاتا کہ جیسکھ کا نزول اجلال ہوا ہے۔

میں چھوٹے سے پوچھتا

"کون ہے؟"

"باپ"

"کیا کہتے ہیں؟"

"خاموشی"

"ابے، کیا کہتے ہیں؟"

"سکوت"

"اچھا، جاؤ، پوچھو، کیا کہتا ہے؟"

چھوٹے باہر پہنچا، باپ سے بات چیت شروع ہوئی۔

"ارے للو، سرکار سے کہہ دی؟"

"میں نے کچھ نہیں کہہ دی"

"پھر کون کہے گا؟"

"تم خود کہنا.........میں نہیں کہوں گا، سُنی؟"

"بڑا ظلمی ہے.........اور وہ جو خان مارے ڈالتا ہے"

"کسے مارے ڈالتا ہے؟ مار سکتا ہے!"

"بڑے سور ما ہو تو سرکار سے کہو، نا"

چھوٹے گھر میں واپس آکر کونہ میں بیٹھ جاتا اور صبح تک واپس نہ آتا، اسکی خودداری اس کی اجازت نہ دیتی کہ وہ کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرے، اس کا باپ اپنی ضرورت سے مجبور ہو کر بہت کچھ جلاتا، اُسے ڈانٹتا، پھٹکارتا، یہ ڈانٹ، پھٹکار بہت زہریلی ہوتی، اس سے بچنے کے لئے وہ زنانہ میں ایسی جگہ پناہ لیتا، جہاں میں اُسے نہ دیکھ سکوں، میں یہ محسوس کرتا کہ اُسے سائل اور سوال پورا کرنے والے دونوں سے نفرت ہو گئی ہے۔

جبیکلو اور ان کی بیوی کو یہ خیال پیدا ہوا کہ چھوٹے کی اب شادی

ہونا چاہیے لیکن جہاں تک مجھے علم ہوا یہ صحیح ہے کہ چھوٹے خود شادی کرنے کے لئے تیار نہ ہوا، ماں بہت روئی گائی، اس نے بہت منت سماجت کی کہ چھوٹے کسی طرح شادی پر تیار ہو جائے، طرح طرح کے لالچ دیئے۔

لڑکی بہت سندر ہے، ...... باپ اس کا مالدار ہے ....

اور تو گھر جوائیں بنے گا .... سُنی تلو .... میرا لال!

مگر

اُس کی ماں جس قدر اُسے پر جانے کی کوشش کرتی، جس قدر اُسکی خوشامد کرتی، اور جس قدر منت سماجت کرتی چھوٹے اسی قدر سختی سے انکار کرتا اس کے جواب میں الفاظ ضرور کم ہوتے، لیکن حقارت اور نفرت کا جذبہ بہت شدید ہوتا۔ اس کی ماں کو خوشی تھی کہ چلو ہم مصیبت میں ہیں تو ہوا کریں چھوٹے کو تو چین حاصل ہو جائیگا، ہماری جس طرح سے کٹ رہی ہے کٹ ہی جائیگی، لیکن تلو تو اپنی زندگی میں چین کرے گا۔ بار بار وہ مادرانہ جذبۂ محبت کے ساتھ چھوٹے کو چمکارتی، پیار کرتی، اس کے سامنے ہاتھ جوڑتی، لیکن لڑکے کا انکار آخر وقت تک انکار ہی رہا۔

میں آخری مرتبہ جب وطن گیا تو معلوم ہوا کہ چھوٹے لام پر چلا گیا ہے، ہندوستان کے سماجی بندھن اور جاہل ماں کے فلسفۂ حیات کو وہ برداشت نہ کرسکا۔